لہ دعوۃ الحق
قرآن وسنت کی تعلیمات کا علمبردار

فون نمبر دارالعلوم ۔ ۴ فون نمبر رہائش ۔ ۲

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

جلد نمبر : ۷ ذولقعد/ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ
شمارہ نمبر : ۴، ۵ جنوری / فروری ۱۹۷۲ء

مدیر ـــــــ سمیع الحق

اس شمارے میں

★

ناشر : سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ ـــــــ مقامِ اشاعت : دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
طابع : منظور عام پریس پشاور ـــــ پرنٹر : محمد شریف ـــــ کتابت : اصغر حسن

مغربی اور مشرقی پاکستان سے سالانہ ۸/ روپے — فی پرچہ ۷۵ پیسے — غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ، ہوائی ڈاک ڈیڑھ پونڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

ہزار سالہ عظمتوں کا جنازہ

وما ظلمھم اللہ ولکن کانوا انفسھم یظلمون

وہ دیکھو ڈھاکہ فتح ہو گیا اور سقوطِ مشرقی پاکستان کے ساتھ اسلام کے لحاظ سے نہیں۔ مگر مسلمانوں کے لحاظ سے دنیا کی عظیم اسلامی مملکت سرنگوں ہو گئی۔ وما تشاءون الا ان یشاء اللہ ان اللہ کان علیماً حکیماً ___ برصغیر پر افقِ مغرب سے طلوع ہونے والا فتح و کامرانی کا روشن ستارہ مشرق کی وادیوں میں ٹوٹ گیا۔ آج دیبل کے ساحل پر محمد بن قاسم کا لہرایا ہوا پرچم سرنگوں ہے۔ احمد شاہ ابدالی کی عظمتوں کا آبگینہ چکنا چور ہو گیا ہے۔ اور سومنات کا جامد اور ساکت بت محمود غزنوی کی ناخلف اولاد پر قہقہے لگا رہا ہے۔ جو گلشن محمد بن قاسمؒ سے لیکر اورنگزیبؒ اور سید احمد شہیدؒ و محمود الحسنؒ کے خون سے سینچا گیا۔ آج وہ اجڑا اجڑا سا ہے۔ پاکستان ہماری خوابوں کا آئینہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور اس کا ہر ذرہ ہماری تصویر پر خندہ زن ہے۔ اللہ کی رسی۔ اسلامؔ۔ کو کاٹ کر مشرق و مغرب کو ملانے کیلئے ہماری تمام تدبیریں نہ صرف ناکامی بلکہ اس شرمناک رسوائی میں اضافہ کا باعث بن گئیں اور آج ملتِ اسلامیہ کے سات کروڑ جگر پارے ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ایھا النفس اجملی جزعا ۔۔۔ فان ماتحذرین قد وقعا

یارائے صبر و شکیب نہیں نہ صبر کا مقام ہے۔ نالہ و شیون کا طوفان برپا کیجئے۔ اور اگر ضمیر، احساسِ ندامت کا ساتھ نہ دے اور غیرت کا پانی خشک ہو جانے سے آنکھیں اشکبار نہیں ہوتیں تو مر جائیے کہ ڈوب مرنے کیلئے اس سے بہتر موقع نہ پا سکو گے۔

بہت سعی کیجئے تو مر رہئے میرؔ ۔۔۔ بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

سقوطِ ڈھاکہ سے ایک ہفتہ قبل جب احساس و شعور کی ساری توانائی یاس و قنوط کے سامنے بے بس ہو چلی تھی اور پچھلے نقشِ آغاز میں قلم اعترافِ عجز پر مجبور تھا۔ تو آج جبکہ یہ واقعہ ہائلہ اور قیامتِ کبریٰ ایک حقیقت بن چکا ہے تو کسے تاب ہے کہ برصغیر کے تقریباً بیس کروڑ

مسلمانوں کے سانحہ مرگ پر مجلس عزا برپا کر سکے برصغیر میں اپنی ہزار سالہ عظمتوں کی مرثیہ خوانی کر سکے اور کفن کورہ کیا گیا ہے — یلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا ہے

نہیں ہے طاقت گفتار اور اگر ہو بھی — تو کس امید پہ کہئے کہ مدعا کیا ہے۔

خلافت بغداد کی تباہی کا ماتم کرتے ہوئے مورخ کبیر علامہ ابن اثیر کو کئی سال تردد رہا۔ قلبی کیفیت کو چھپا نہ سکے اور لکھا کہ اسلام اور مسلمانوں کی خبر موت سنانا کس کو آسان ہے اور کس کا جگر ہے کہ ان کی ذلت و رسوائی کی داستان سنائے۔ کاش! میں نہ پیدا ہوتا۔ کاش میں اس واقعہ سے پہلے مرچکا ہوتا اور بھولا بسرا ہو جاتا۔ (الکامل جلد ۱۴۷/۱۲) مگر آج کی یہ ذلت واضحہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہماری پوری تاریخ کا ذلیل ترین سانحہ ہے۔ بابل کا بابر بادشاہ بخت نصر یروشلم سے ایک لاکھ یہودیوں کو قیدی بنا کر لے گیا تھا کہ ان کی ذلت و مسکنت کی انتہا ہو چکی تھی مگر عہد اسلام تو اس مثال سے ناآشنا ہے۔ مسلمان اور شکست مومن اور ہتھیار ڈالنا تو اتنی متضاد چیزیں ہیں خلفائے کرام اسلام اور کفر و اسلام کی تاریخ میں نہایت شاذ و نادر مثال فتوحات عراق میں صرف ایک جگہ ملتی ہے کہ نہایت مجبوری کی وجہ سے چند لوگوں کو پیچھے ہٹنا پڑا جبکہ ساتھیوں نے میدان جیت کر دم لیا پھر بھی اس واقعہ کا اتنا افسوسناک اثر ہوا کہ جن لوگوں کو پیچھے ہٹنا پڑا وہ مدتوں خانہ بدوش پھرتے رہے۔ شرم سے اپنے گھروں کو نہیں جاتے تھے۔ اکثر رویا کرتے اور لوگوں سے منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ مدینہ منورہ میں یہ خبر پہنچی تو ماتم پڑ گیا۔ جو لوگ مدینہ پہنچ کر روپوش تھے اور شرم سے باہر نہیں نکلتے تھے حضرت عمرؓ ان کے پاس جا کر تسلی دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم او متحیزا الی فئۃ میں داخل ہو مگر ان کو اس تاویل سے تسلی نہیں ہوتی تھی۔ (الفاروق)

مگر چرخ نیلگوں نے یروشلم کے بعد پہلی مرتبہ ڈھاکہ سے ایک لاکھ قیدیوں کی شکل میں تاریخ کو دہراتے دیکھا پھر کیا یہ ہماری بے مثال ذلت کی شہادت نہیں؟

ذلک بان اللہ لم یک مغیراً	یہ قدرت کا قانون ہے کہ اس کی دی ہوئی نعمتوں
نعمۃ انعمھا علی قوم حتیٰ	کی بے قدری کرنے والوں کو ذلت اور نامرادی
یغیروا ما بانفسھم	کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ قوم خود اپنی حالت
	نہ بدل ڈالے۔

پھر کیا یہ اسلام کی شکست ہے؟ کیا نصرت خداوندی اب عصر حاضر کے ظالم اور باطل طاقتوں کا سامنا نہیں کر سکتی۔؟ کیا حق باطل کے سامنے سپر انداز ہو چکا ہے۔؟ اور سب سے

بڑھ کر یہ کہ کیا خدائے حی وقیوم سومنات کے مردہ اور جامد پتھروں کے سامنے عاجز اور بے بس ہوچکا ہے۔؟ نہیں ہزار بار نہیں۔ اپنی رسوائی اور ناکامی کو اسلام کے سر تھوپنے والو کیا یہ اسلام اور کفر کا مقابلہ تھا۔ اور کیا آخری مقابلہ ہوچکا ہے۔؟ کیا بدر وحنین اور یرموک وقادسیہ مسلمانوں کے نہیں ہندوؤں کے معرکہائے خونیں تھے۔؟ کیا بحرالکاہل کی متلاطم موجوں کو چیر کر جبل الطارق پر علم توحید نصب کرنے والے کوئی اور تھے۔ کیا پانی پت اور میسور کے میدان کسی اور کے خون سے لالہ زار بنے تھے۔؟ کیا برصغیر میں پھیلے ہوئے شکستہ کھنڈرات کسی اور کے عہدِ اقبال کی شہادت دے رہے ہیں۔؟ اور کیا جلال وجبروت کا سرچشمہ خدائے بزرگ وبرتر بندوں کی بے جان مورتیوں سے شکست کھا سکتا ہے۔؟ کبھی نہیں۔ حق وباطل کی پوری تاریخ میں ایسی کوئی شہادت نہ پاسکو گے۔ پھر یہ کیا تھا۔؟ یہ شکست قانونِ مکافاتِ عمل کا ظہور اور شامتِ اعمال کا نتیجہ تھا۔ وماظلمھم اللہ ولکن کانوا انفسھم یظلمون — نصرت اور قوتِ خداوندی تو ہمیشہ قائم اور دائم رہنے کے لئے ہے۔ اور کسی کو اس پر یقین نہ ہو تو پھر اسے چاہئے کہ اوپر کی طرف ایک رسی تان کر اس کا پھندا بنائے اور اس طرح اپنے گلے میں پھانسی لگائے۔ من کان یظن ان لن ینصرہ اللہ فی الدنیا والآخرۃ فلیمدد بسبب الی السماء ثم لیقطع فلینظر ھل یذھبن کیدہ ما یغیظ۔

پس یہ اسلام کی شکست نہیں جو ایک ابدی حقیقت اور سرمدی صداقت ہے۔ بقاء اس کی معیت اور فنا اس سے گریز میں ہے۔ بلکہ یہ تو عروج وزوال امم کے لئے اللہ کے اٹل قوانین اور سنت اللہ کا ٹھیک ٹھیک ظہور ہے۔ ذرا بھی اپنے شکستہ دل کے گوشوں میں اس المیہ کے اسباب ٹٹولو گے تو یہ نتائج تعجب خیز نہیں بلکہ سنت اللہ کے عین مطابق معلوم ہوں گے۔ ایسا نہ ہوتا تو اس سنت کی تبدیلی سب کو محوِ حیرت کر دیتی۔ پس یہ رسوائی اسلام کی نہیں رو اللہ کے مخلص بندوں کی ہے بلکہ اعمال کا سنگدلانہ ردِ عمل اور گھناؤنا انتقام ہے۔ نفاق اور کھوکھلے نعروں کی شکست۔ قول وعمل کے تضاد اسلام کو نعرۂ فریب واستحصال بنانے کی شکست ہے۔ یہ عیاری، عیاشی اور بے حیائی کی شکست ہے۔ یہ اختلاف وانتشار اقتدار کے لئے رسہ کشی کا نتیجہ ہے یہ میکیاولی سیاست کی موت ہے کہ فاروقی سیاست تو غائب رہنے کیلئے تھی۔ یہ خود غرضی اور ہوسِ اقتدار کا وبال ہے اور گاڑی ہلاکت اور بربادی کی اپنی اسی منزل میں جاگری ہے جس کی راہ پر ہم نے اسے ڈال دیا تھا۔

اب ہم لاکھوں تحقیقاتی کمیشن قائم کریں، جنگی اور سیاسی اسباب ٹٹولیں۔ ایک دوسرے کو

قربانی کا بکرا بنا کر اپنے مجرم ضمیر کی آسودگی کا سامان کریں۔ ہماری عظمت کا قصر رفیع جو پیوند خاک ہو چکا ہے۔ بلند نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ یغیروا ما بانفسہم۔ لٹی ہوئی آبرو تحقیقاتی کمیشنوں سے واپس نہیں ہو سکتی۔ نہ نفس اور قوم کو فریب دینے کے لئے اس سعی لاحاصل کی ضرورت ہے۔

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا ۔۔۔ کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے

اپنی حالت بدلنے کی بجائے ان ابلہ فریبیوں میں پڑنے والو کہیں کلک تقدیر نے یہ کہہ کر پوری قوم کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا حکم تو نہیں دیا کہ ع۔ ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

بیشک مایوسی کفر اور یاس وقنوط پیغام موت ہے مسلمان مایوس نہیں ہوتا لیکن وہ اسلام جو مردہ قوموں کے لئے حیات جاودانی کا مژدہ بنتا تھا۔ اس پورے عرصۂ آزادی میں کبھی اپنایا گیا۔؟ اپنایا ہوتا تو یہ روز بد کیوں دیکھتے۔ پھر آج امید و بیم کی دنیا بسائی جائے بھی تو کیسے۔؟ ہمارے پاس رہ کیا گیا ہے۔ چند آنسو چند حسرتیں اور چند آہیں۔ قوم کا ساز حیات ٹوٹ چکا ہے اور وہ جسے ہم عالم اسلام کا حصار کہتے تھے خود ہمارے ہاتھوں ٹوٹ چکا ہے۔ ہم نے صلاح الدین کی آبرو مسجد اقصیٰ یہودیوں کے ہاتھوں لٹادی، وسط ایشیا ہمرقند و بخارا میں اپنی سرخروئیوں کا خزانہ اپنے ہاتھوں دفن کیا۔ اسپین اور سسلی میں اپنی متاع عظمت وشوکت تاراج کرنے والو آج ھند میں محمود غزنوی کی قبائے عزت وافتخار بھی ہمارے ہاتھوں تار تار ہو چکی ہے۔ مگر ہماری عشرت نائی اور ہوسناکیوں میں لمحہ بھر کیلئے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہیں اس مصیبت کبریٰ کا واقعی احساس ہے۔ کتنی آنکھیں خونبار ہو چکی ہیں کتنے قلوب فرط غم سے پھٹ چکے ہیں اور کتنے ہیں جو زندگی کی رنگینیوں کو چھوڑ کر دشت وصحرا کے ویرانوں کو اپنی آہ و بکا سے آباد کر چکے ہیں اور کتنے ہیں جنہیں اب اس "عظیم المیہ" سے سبق لینا ہے۔۔۔ اٹھو دیکھو پورا برصغیر اسلام کا غربت کدہ بن چکا ہے۔ اور اگر تمہارے مقدر میں رونا ہی رہ گیا ہے تو اٹھو اور اپنے نالہ وشیون سے عالم افلاک میں تہلکہ مچادو۔ شاید رب السموات والارض کو ہماری پستی اور بے بسی پر ترس آجائے۔ مسلمانو! سقوط ڈھاکہ وقتی حادثہ نہیں یہ ہند میں تمہارے اسلاف کی تیرہ سو سالہ عظمتوں اور قربانیوں کا جنازہ ہے۔ اب تمہیں روٹی کپڑا اور مکان کی نہیں کھوئے ہوئے لباس مجد وشرف کی ضرورت ہے۔ اور اگر اس حال پہ خوش ہو تو یاد رکھو کہ خدا کی بستی میں اس لباس سے ننگی قوم کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور

یہی ہے زندگی تو زندگی سے موت بہتر ہے ۔۔۔ کہ انسان عالم انسانیت پہ بار ہو جائے

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

سمیع الحق
۲۱ر فروری ۷۲ء

سمیع الحق

پیمانۂ دل چھلکتا ہے

● سنا ہے شیخ مجیب نے شراب پر پابندی لگادی، حریف جنگ کے بعد اخلاق میدان میں بھی بازی لے گیا۔ رہی سیاست تو وہاں پارلیمانی نظام کا غلغلہ ہے اور یہاں مارشل لاء کی مدح سرائیاں اور جو مملکت جامِ شراب پر لٹادی گئی وہاں شراب کا دور دورہ نہ ہوگا تو کہاں ———

ع کس رو سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز۔

● اُدھر جنگ لڑ رہے تھے، اِدھر لاکھوں روپیہ ایک فاحشہ مغنیہ کے دوروں پر خرچ ہو رہا تھا اور ۱۹۶۵ء میں بھی تو اسے ہی تمغہ دیا گیا تھا۔ کاش! ہم جانتے کہ تقدیریں شمشیر و سنان سے بنتی ہیں، طاؤس و رباب کا ہر ساز و آواز تو کسی قوم کے خبر مرگ کا انتظار ہوتا ہے۔

● خلیفہ مستعصم کے شیعہ وزیر ابن علقمی نے کسی شیعہ سنی فساد پر ناراض ہو کر ہلاکو کے ہاتھوں پوری خلافت بغداد تباہ کروڈالی، معلوم نہیں ہمارے دور کے ابن علقمی یحییٰ خان رافضی نے کس کربلا کے انتقام میں پوری اسلامی مملکت برباد کر ڈالی ہے یا پھر قدرت نے ہمیں ابن علقمی کی تاریخ دہرانے پر خود یہ سزا دی ہے۔

● یحییٰ خان کی رسوائیوں کے چرچے ہیں کوئی شریف خاتون تو کیا زنان بازاری بھی اس رسوائے عالم کو اپنی گلی میں جگہ نہیں دیتیں بے شک عزت و ذلت اللہ کے ہاتھ ہے انگی چادر رحمت ذرا سرک جانے تو سب کچھ ہیچ دکھائی دیتا ہے ———

● پشاور میں یحییٰ خان کے لٹے پٹے گھر میں صرف بار روم سلامت رہ گیا ہے۔ یہ ہے کسی عظیم اسلامی مملکت کے "امیر المومنین" کا اثاثہ اور کچھ شکستہ جام و سبو بھی جو "پسماندگان" کے کام آسکیں۔ کچھ ٹوٹی ہوئی مینائیں جو اس ساقی کو رو رہی ہیں جس کی گردش میں کل تک پیمانے نہیں بھرے میخانے لٹا کرتے تھے۔

ع بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا۔

● نئی حکومت نے ایک وزارت خاندانی منصوبہ بندی کی بھی بنا رکھی ہے۔ قدرت کی اتنی بڑی منصوبہ بندی کے بعد کہ ہم گیارہ کروڑ کی بجائے پانچ کروڑ رہ گئے۔ کسی اور منصوبہ بندی کی ضرورت رہ گئی ہے۔ اور اگر خواہ مخواہ محسوس ہوتی ہے تو اسے بھی قدرت پہ چھوڑ دیجئے اور انتظار کیجئے۔

● شہنشاہ ایران ہماری اشک شوئی کے لئے تشریف لائے۔ بعد از مرگ اس "ماتم عزا" میں شمولیت بھی لائق صد تشکر ہے کہ "جشن ایران" میں ہماری وارفتگیوں کا صلہ "شام غریباں" میں شریک ہو کر تو مل گیا مگر دل سے رہ رہ کر صدا اٹھتی ہے کہ ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا ——— نہ ماتم عزاداری کی ضرورت رہتی اور نہ جنازہ کو کندھا دینے کی۔

حضرۃ علامہ شمس الحق افغانی

سقوطِ ڈھاکہ و مشرقی پاکستان

بجواب
خط
ایڈیٹر الحق

آپ نے مجھے اس عنوان پر لکھنے کے لئے تحریر بھیجی۔ میں متردد تھا کہ میں وہ دل کہاں سے لاؤں جو مجھے اس المیہ پر کچھ لکھنے کی استطاعت دے سکے۔ اسلام کی پوری تاریخ میں سب سے بڑا دردناک المیہ ہلاکو کا ہے۔ اس ہنگامہ کی تحریر سے ابن اثیر نے تاریخ کامل میں معذرت خواہی کے طور عجزِ قلم کا اعتراف کیا۔ لیکن المیہ ہلاکو سے ۷۱۵ سال بعد کا یہ واقعہ جو ابھی وقوع میں آیا اس سے انتہائی دردناک ہے بوجوہات ذیل :

۱۔ ہلاکو کے واقعے میں مسلمان تاریخ کے ایک بہادر ترین قوم منگولین سے مغلوب ہوئے۔ لیکن واقعہ بنگال میں ہماری مغلوبیت کرۂ ارضی کی بزدل ترین بنیا قوم سے ظہور میں آئی ہے، جو افسوسناک ہے۔

۲۔ ہلاکو کے واقعہ میں اس یلغار کا سربراہ دنیا کا مسلم بہادر اور ماہر جنگ ہلاکو تھا۔ لیکن ہمارے اس واقعہ میں ہندو یلغار کی سربراہ ایک ہندو عورت تھی۔ اور ہماری طرف سے تمغہ جات اور فوجی امور کا ماہر جنرل یحییٰ خاں ہائی کمان تھا۔

۳۔ ہلاکو کی یلغار میں مغلوبیت ظاہری برنگ شہادت تھی۔ اور ہمارے موجودہ واقعہ میں مغلوبیت نے ہتھیار ڈالنے کی صورت اختیار کی وہ بھی تقریباً مسلح نوّے ہزار بہادر فوج نے جس کی نظیر اسلام کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔

۴۔ ہلاکو کے ہنگامہ میں جس ملک پر حملہ ہوا اس کے جواب میں دوسرا کوئی محاذ نہ تھا کہ دشمن پر دو محاذوں کا دباؤ پڑتا۔ لیکن یہاں مغربی طاقتور محاذ موجود تھا۔ اگر زور سے اس محاذ پر حملہ کیا جاتا۔ تو کشمیر کا مسئلہ بھی ہمیشہ کے لئے حل ہو جاتا۔ اور دشمن کا اتنا زرخیز علاقہ ہمارے قبضہ میں آجاتا کہ دشمن یا تو مشرقی محاذ پر حملے سے دست بردار ہو جاتا یا کم از کم اس کا دباؤ کمزور پڑ جاتا۔ لیکن یہاں فوری

حملہ سے گریز کیا گیا کہ دشمن اطمینان کے ساتھ ہماری ناکہ بند فوج کو اچھی طرح تباہ کر دے اور جنگ بندی کے قریب دنوں میں جو حملہ کیا گیا۔ وہ بھی اس وقت جب دشمن نے حملہ کیا اور پھر ہمارے ہائی کمان نے بدفاعی جنگ لڑی۔ تاکہ دشمن کے علاقہ پر قبضہ نہ ہو۔ ورنہ کٹوعہ روڈ کاٹ دینے میں صرف ۲۴ گھنٹے باقی تھے۔ اور اگر موجودہ فوج اور ہوائی بیڑے کو استعمال کیا جاتا۔ تو کشمیر ختم ہو کر بھارت کی دو تین لاکھ فوج محصور ہو جاتی۔ اور مشرقی پنجاب میں ہماری فوج پٹھانکوٹ، فیروزپور، امرتسر، جالندھر کے اضلاع کو فتح کر کے لدھیانے کے قریب پہنچ سکتی تھی۔ اور راجستان میں بھی کافی رقبہ فتح ہو جاتا تھا۔ اس صورت میں دشمن گھٹنے ٹیک کر اور ہماری منت سماجت کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اگر مشرقی پاکستان میں ناکامیابی ہوتی تو وہ بھی فتح میں تبدیل ہو جاتی۔ دشمن کی فوج کا حوصلہ بھی پست ہو جاتا۔ جیسے بی بی سی کے نمائندہ نے مشرقی پاکستان کے مورچوں کو دیکھ کر یہ کہا تھا۔ کہ بھارتی فوج پاکستانی فوج کا سامنا کرنے سے گھبراتی ہے۔ ممکن ہے کہ کسی وقت جنگ سے انکار کر دے۔ لیکن پاکستانی فوج کے حوصلے تعداد کی کمی کے باوجود بلند ہیں۔

۵۔ آشوب ہلاکو کے موقعہ پر جس اسلامی ملک پر حملہ ہوا اس کا کوئی مددگار نہ تھا۔ لیکن ہمارے لئے مغربی محاذ میں قابلِ اعتماد طاقتور پڑوسی چین موجود تھا۔ جو ہماری طلب پر اسلحہ اور ہر قسم کی مدد گلگت روڈ کے ذریعہ پہنچاتا۔ لیکن ان پانچ امور کے باوجود جو کچھ المیہ پیش آگیا۔ اس کا زخم صدیوں تک مندمل نہیں ہو سکتا۔ اب تشریح طلب یہ امر ہے کہ :

۶۔ حضور علیہ السلام جن کی دعا اور روحانی قوت سے بہت بڑی قوت پر بھی فتح ہو سکتی تھی۔ لیکن آپ نے عالم اسباب میں تعلیم امت کیلئے مدینہ میں آ... یہود قریظہ و بنی نظیر و بنی قینقاع کے طاقتور قبائل سے تعاون باہمی کا معاہدہ کیا تاکہ دشمن کے مقابلہ میں متحدہ محاذ قائم ہو۔ لیکن ہم نے کسی بڑی طاقت حتیٰ کہ چین کے ساتھ بھی تحریری معاہدہ نہیں کیا حالانکہ دشمن نے اگست میں روس سے بیس سال کے لئے معاہدہ کر لیا تھا۔ جو ہماری موت اور تباہی کے لئے کیا گیا تھا۔ اس غفلت کا وہ نتیجہ ہوا۔ جو سامنے آیا۔ اس رسوا کن اور وقار شکن شکست کے اسباب کیا تھے۔ میرے خیال میں وہ اسباب حسب ذیل ہیں :

۱۔ پاکستانی نظریۂ اسلام سے بغاوت، تقسیم ہند اور پاکستان کے وجود و بقاء کی اصلی روح اسلامی نظامِ حیات ہے، معمارِ پاکستان اور کارپردازانِ پاکستان نے اسلامی نظریۂ حیات کی بدولت برصغیر کے مسلمانوں کو اپنا ہمنوا بنایا اور اسی نظریہ کی کشش سے وہ تاسیسِ پاکستان کے

واسطے ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہوئے اور اسلام کی محبت کی وجہ سے مسلمانوں نے پاکستان کو وجود میں لانے کیلئے وہ قربانی دی جسکی نظیر تاریخ اسلام میں نہیں ملتی۔ اربوں کی جائیداد کو مسلمانوں نے قربان کیا۔ وطن کو قربان کرنا پڑا۔ لاکھوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ ہزاروں عصمتیں لٹ گئیں لیکن جب پاکستان بن گیا، تو اللہ اور عوام دونوں سے کیا ہوا وعدہ بھلا دیا گیا۔ اور جن ارباب اقتدار کے ہاتھوں پاکستان کی باگ تھی۔ انہوں نے چوبیس سال میں اسلام کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ نہ اسلامی قانون ملک میں رائج ہوا اور نہ فواحش و منکرات بند ہوئے بلکہ ان سب چیزوں میں اضافہ ہوا۔ گویا پاکستان کی نعمت کی ناشکری کی گئی۔ اور جتنا دین اور اسلام پر جسقدر عمل انگریزی دور میں تھا وہ بھی نہ رہا۔ یہ وہ کفرانِ نعمت ہے کہ شکر کی صورت میں ترقی کا وعدہ خداوندی ہے۔ اور کفرانِ نعمت کی صورت میں قہر الٰہی اور عذاب شدید کی سزا کا اعلان موجود ہے۔ لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی لشدید۔ زمین پر جو کچھ ہوتا ہے۔ پہلے وہ آسمان پر طے ہوتا ہے۔ چوبیس سال میں صرف قوم کی دولت کو لوٹنے اور کرسیوں کے تحفظ کی کوشش کی گئی۔ خواہ پاکستان ہاتھ میں رہے یا جائے۔ جب نظریۂ پاکستان کی روح قریب الختم ہونے لگی۔ تو اعضاءِ پاکستان کا انتشار لازمی تھا۔

۲۔ دوسرا سبب قرآنی ارشاد کی تعمیل سے بغاوت۔ اللہ کا ارشاد ہے۔ واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم۔ دشمن کے مقابلہ کیلئے اسقدر آلات حرب تیار کرو جسقدر مجموعی طور پر تمہاری قوۃ مالی کی آخری سرحد تک ممکن ہو۔ اور گھوڑوں کو بھی سرحد کی حفاظت کیلئے رکھو۔ جو اس زمانے میں ٹینک کا کام دیتے تھے۔ ہمارا سامانِ جنگ اس قدر ہو کہ دشمن اس سے مرعوب ہو جائے۔ بھارت نے اسلحہ سازی کے تیس کارخانے بنائے اور ہم عیش و عشرت کے سامان میں مال خرچ کرتے رہے ہم سے پانچ کارخانے بھی نہ بنائے جاسکے صرف ایک واہ فیکٹری ہے وہ بھی مکمل نہیں۔ چین ہم سے ایک سال بعد آزاد ہوا، وہ ایٹم بم ہیڈروجن اور میزائلوں کے بنانے میں اس قدر ترقی کر چکا ہے کہ جو بڑی طاقتیں ان سے دو سو سال قبل میدان سائنس میں گامزن تھیں آج وہ ان سے کانپ رہی ہیں۔

۳۔ تیسرا سبب نصاب تعلیم اور معلمین کی خرابی۔ نہ نصاب تعلیم اسلامی اور پاکستانی نظریہ کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اور نہ معلمین ایسے رکھے جاتے ہیں۔ جن کا ذہن اسلامی ہو نتیجہ ظاہر ہے کہ خوفِ خدا ختم ہو کر صرف شکم پروری کے تحت حرام و حلال کے فرق کئے بغیر جمع دولت کا

مجنونانہ جذبہ اور نسلی اور صوبائی تعصب کا تصور پیدا ہوا جس کا انجام وہی ہوا جو ہم نے سقوطِ مشرقی پاکستان کی شکل میں دیکھا اور ہماری ملت کے حصار کے اس شگاف اور کمزوری کو دشمن نے تاڑ کر اس سے فائدہ اٹھایا۔ اب خدا مغربی پاکستان کو محفوظ رکھے۔ معلم میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس کی اسلامی تعلیم کہاں تک اسلامی معیار پر ہے۔ اسلامی عقائد کا معتقد بھی ہے، یا اس سے باغی۔ ارکانِ اسلام کی پابندی کہاں تک ہے۔ بس یہ دیکھا جاتا ہے۔ کہ ڈگری ہو اور رشوت یا کسی افسر کی سفارش یا قرابت ہو۔

۴۔ چوتھا سبب عیاشانہ زندگی۔ عیاشانہ زندگی پوری ملت کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ خصوصاً فوج کے لئے جو محافظ ملک ہے اور جفاکشی فوجی زندگی کی روح ہے۔ فاروق اعظمؓ نے شام و عراق کی فتح کے بعد اسلامی فوج کے لئے پابندی عائد کی کہ باریک عیاشانہ لباس استعمال نہ کریں۔ اور عجمیوں کی زیب و زینت سے پرہیز کریں۔ اور غسل کی ضرورت ہو تو حمام میں نہ جائیں۔ اگر پسینہ لانے کی ضرورت ہو تو بجائے حمام کے دھوپ میں خوب دوڑیں۔ فانہ حمام العرب۔ یہ عرب کا حمام ہے۔ جب سے فوجی حکومت قائم ہوئی تو فوجی حکمران نے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کی غرض سے ان کی تنخواہیں تمام ملکوں سے زیادہ بڑھائیں۔ اور زمینوں کے مربعے بھی عطا کئے۔ نیز ان کو اقتدار میں شریک کرنے کی وجہ سے ان کو رشوت کا بھی خوگر بنایا۔ یہ عادت ہماری فوج میں نہ تھی۔ ان چیزوں نے عام فوجی سپاہیوں اور معمولی درجے کے عہدہ داروں کی زندگی پر اثر نہ ڈالا۔ لیکن اونچے درجے کے بعض افسران اس کے شکار ہوئے۔ اور ان میں فوجی فرائض اور جذبہ جہاد کا میلان حبِ دنیا کی وجہ سے کمزور پڑ گیا۔ اور نتیجہ وہ ہوا جو آپ کے سامنے ہے۔ پھر بھی میں کہوں گا۔ کہ ہماری عام فوج کو شکست نہیں ہوئی۔ بلکہ مہارانی (اندرا) نے رانی محبوبہ یحییٰ کو شکست دی ــــــ

۵۔ ابن علقمی کی تاریخ سے غفلت۔ تاریخ نہایت سبق آموز چیز ہے۔ ماضی کے واقعات مستقبل میں بھی موثر ہوتے ہیں۔ ابن علقمی جن عقائد و افکار کا حامل تھا۔ اس نے خلافتِ عباسیہ کی پانچ صد سالہ یا اس سے زیادہ کی اسلامی عظمت کو اپنی موہوم خودغرضی کی وجہ سے پیوند زمین کیا۔ اور مسلمانوں کی سیاسی عظمت کے علاوہ ان کے چھ سو سالہ دماغی کاوشوں کا علمی سرمایہ بھی نذرِ آب و آتش کر دیا جسکی تلافی آج تک نہ ہو سکی۔

۶۔ اتحاد کا فقدان۔ حدیث میں حضورؐ سے وعدہ کیا گیا ہے کہ مسلمان اگر دشمن کے ساتھ شامل

نہ ہوئے ہوں۔ تو وہ مغلوب نہ ہوں گے۔ اس واقعہ میں مسلمان خود ہندوؤں کے ساتھ شامل ہوئے۔

علاج مستقبل | ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین۔ (آل عمران ع ۱۴)
شکست احد میں نازل شدہ یہ آیت ہماری اس شکست کا بھی علاج ہے۔ جس میں دو منفی چیزیں اور ایک مثبت اور پھر غلبہ کا وعدہ ہے۔ اول مثبت وہن چھوڑنا ہے۔ کسی چیز میں وہن اس کو قرآن نے جہانگیری کے خیال سے عام رکھا یعنی جو چیزیں اسباب شکست ہوئی ہیں ان کے ازالہ اور دور کرنے میں سستی نہ کرو۔ دیر بھی نہ کرو۔ فوراً دور کرو کہ ازالہ مرض سبب مرض کے ازالہ سے ہوگا۔ مذکورہ اسباب کے پیش نظر اسلامی قانون اسلامی نظام اسلامی تعلیم نافذ کرو۔ اور خلاف اسلام امور بند کر دو۔ ۲۔ اخراجات حکومت و عوام کم کر کے دولت کا اکثر حصہ اسلحہ اور اسلحہ ساز کارخانوں میں لگا دو۔ ۳۔ نسلی اور علاقائی تعصبات رد کرو۔ اور اخوت اسلامی کو فروغ دو۔ ۴۔ سادہ زندگی اختیار کرو۔ جیسے چین نے کیا ہے۔ اور عیاشانہ زندگی ختم کرو۔ بیش قیمت فرنیچر اور عظیم الشان بنگلوں کی تعمیر ختم کرو۔ خوراک و پوشاک سادہ رکھو۔ ۵۔ ذمہ دار افسر کے تقرر میں اس کے عقائد و افکار اور اعمال کا خیال رکھو اور یہ کہ ان میں خوف خدا و آخرت بھی ہے یا نہ۔ ۶۔ ہر اتحاد شکن تحریر و تقریر پر پابندی لگاؤ تاکہ اسلام کی وحدت پارہ پارہ نہ ہو اور بدعقیدہ افراد کو ذمہ دارانہ عہدہ نہ دو۔ جو مسلمانوں کے نظریہ حیات ہی سے متفق نہیں۔ روس میں ایسے شخص کو ذمہ دار عہدہ دیا جا سکتا ہے۔ جو سوشلسٹ عقیدہ میں شک نہ کرتا ہو۔ ہنگری سوشلسٹ کے عام عقیدہ روس میں معمولی تاویل کی تو اسکو کچل دیا گیا۔ کیا کلیدی اسامیوں کیلئے یہ ضروری نہیں کہ کم از کم وہ مسلمانان تیرپاکستان اور مسلمانان عالم کو مسلمان تو سمجھتا ہو اور اسکا عقیدہ عام مسلمانوں سے الگ نہ ہو۔ ۷۔ خطبوں میں اور تقریروں میں صوبائی اور علاقائی تعصبات کی حوصلہ شکنی کرو۔ اور وحدت اسلامی پر زور دو۔

آخر میں ہمیں اللہ کی طرف رجوع کر کے اپنے گناہوں سے توبہ کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کی وحدت کا سامان اور اسکی حفاظت کی کفالت فرماویں۔ اور پاکستانی مسلمانوں کے قلوب کو بدل ڈالیں تاکہ ہم دنیا کی ذلیل و مکار ترین قوم کی دوامی غلامی سے محفوظ رہیں۔ آمین۔

حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب صدیقی

غدار کون اور کیوں؟

ع آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین

فَفِرّوا الی اللّٰہ

کلیجہ خون اور دل ناصبور ہے، لکھنے کی طاقت کہاں سے لاؤں، ہزیمت فلسطین کا زخم ابھی ہرا تھا کہ دوسری ذلت آمیز شکست کا منحوس اور بھیانک چہرہ دیکھنا پڑا۔ مومن کا کام صبر اور اس کے ساتھ عبرت و نصیحت حاصل کرنا ہے۔ اس لئے اسباب شکست پر روشنی ڈالنا بھی ایک فریضہ ہے جسے اس عالم دل شکستگی میں بھی کسی نہ کسی طرح ادا کرنا ضروری ہے۔

—— یہ بات تو بالکل کھلی ہوئی ہے۔ اور غالباً پاکستان کا ہر فرد اس سے واقف ہو گیا ہوگا کہ ہماری شکست غداری کی وجہ سے ہوئی، ورنہ ہماری پوزیشن ایسی نہ تھی کہ ہمیں اتنی ذلت کے ساتھ ہتھیار ڈالنا پڑتے اور اپنے لاکھوں بھائیوں کو دشمنوں کی درندگی اور اس کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے لئے چھوڑ دینا پڑتا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ غداری ان گروہوں نے کی ہے جو اسلام کے مدعی ہیں، لیکن درحقیقت اسلام کے دشمن ہیں، وہ اپنے کو جو مسلمان کہتے ہیں۔ تو اسلام کی ایک مخصوص اصطلاحی تعریف پیش نظر رکھتے ہیں جو انہیں پر منطبق ہوتی ہے۔ ہم سُنّی جس دین کو اسلام کہتے ہیں اس سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بلکہ عداوت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انہیں اس غداری کی جرأت کیوں ہوئی جبکہ ہماری یعنی اہل سنت کی اکثریت ہے۔ اور ہم میں سے بعض افراد ان کے اس ناپاک مقصد کو پورا کرنے کے لئے ان کے معاون کیوں بن گئے۔؟ یہ اتفاقی طور پر ہو گیا یا اس بارے میں ہم سے ہی کوئی قصور ہوا ہے۔؟ اس چیز کا دیکھنا اس وقت زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ مغربی پاکستان بھی اس وقت سخت خطرے میں ہے۔ اگر ہم اپنی غلطیوں کی تلافی کر لیں تو انشاء اللہ اسے نقصان نہ پہنچے گا، ورنہ اندیشے تو ایسے ہیں جن کا تصور بھی لرزہ براندام کر دیتا ہے۔

—— حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہوا وہ خلاف توقع نہیں ہوا۔ اصحاب بصیرت اور

باخبر افراد بہت دن سے اس اندوہناک انجام کو دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ ہماری مسلسل غلطیوں کا منطقی نتیجہ یہی نکلنا چاہیئے تھا۔ اور سنت اللہ یہی ہے کہ جب اس قسم کی غلطیاں کی جاتی ہیں تو عذاب الٰہی اسی صورت سے آتا ہے۔ جس سازش کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے اس کے بارے میں بعض باخبر افراد نے جو عوام میں غیر موثر ہونے کی وجہ سے خود کچھ نہ کر سکتے تھے اور جن کی آواز سننے کیلئے پبلک تیار نہ ہوتی بعض ذمہ دار مقبول عام اور موثر آواز رکھنے والے سیاسی قائدین کو ایک سال پہلے مطلع کر دیا تھا۔ بلکہ بعض کو تو سازش کے ابتدائی مدارج سے دو ڈھائی سال پہلے مطلع کر دیا تھا۔ مشرقی پاکستان کو بھارت کی گود میں ڈال دینے کی سازش کا اس وقت تک انہیں علم نہ تھا۔ لیکن اس کی تمہید کا علم ہو گیا تھا جس کی اطلاع انہوں نے بعض ذمہ دار سیاسی قائدین کو دیدی تھی، لیکن یہ قائدین جرأت و ہمت کی صفت سے محروم ہیں، ان میں وہ جذبۂ قربانی نہیں ہے جو ایک سیاسی قائد کا جوہر ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ساکت وصامت رہے اور سازش کی کھلی ہوئی علامتیں دیکھنے کے بعد بھی اس سے بے خبر بنے رہے۔ مارشل لاء کا خوف، جیل جانے کا خطرہ اور آرام دہ زندگی چھوٹنے کا اندیشہ افضل الجہاد سے مانع رہا۔ حالانکہ اگر وہ دوسری مؤثر شخصیتوں کو مطلع کر کے اجتماعی طور پر اس راز کو فاش کر دیتے اور غداروں کے چہرے پبلک کو دکھا کر انہیں نکالنے کا مطالبہ کرتے تو حکومت انکا کچھ نہ بگاڑ سکتی اور اس حادثہ جانکاہ تک نوبت نہ پہنچتی۔

ان غلطیوں کی تفصیل تو بہت طویل ہے۔ ان کا اسوقت تذکرہ مقصود نہیں ہے۔ میں تو اس بنیادی بات کا تذکرہ کر کے دعوت فکر و عمل دینا چاہتا ہوں جو ہماری سب غلطیوں کا اصل سبب ہے۔ یہ بات تو بالکل کھلی ہوئی ہے۔ کہ جس المیہ سے ہمیں دوچار ہونا پڑا وہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے۔ جو ہماری غیر اسلامی زندگی، ہمارے معاشرے کے گناہوں اور اس میں انابت الی اللہ کے فقدان کی سزا اور اسکا وبال ہے۔ ہمارے معاشرے کی معصیت کوشی عمل کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ زہر عقائد تک پہنچ گیا۔ اور ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو کھلم کھلا لادینیت کی دعوت دیتا ہے اور اسلام کے بنیادی عقائد کا مذاق اڑاتا ہے۔ ان ملحدین سے قطع نظر کثیر تعداد ایسے افراد کی پائی جاتی ہے۔ جن کے بنیادی عقائد تو صحیح ہیں لیکن عملاً انہوں نے ان عقائد کو زندگی سے خارج کر دیا ہے۔ یہ عقائد ان کے ذہن کے ایک گوشے میں تو ضرور پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی عملی زندگی ان سے بالکل بے نیاز ہے اور وہ فسق و فجور میں اس قدر بیباک ہیں جسقدر ایک غیر مسلم۔ کیا یہ حالات اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینے والے نہیں ہیں۔؟

—— اس کے ساتھ یہ واقعہ بھی سامنے رکھئے کہ پورا پاکستان فاسقوں سے بھرا ہوا

نہیں ہے۔ الحمدللہ کہ ہمارے ہاں دیندار طبقہ بھی خاصی تعداد میں ہے۔ اس میں علماء و مشائخ بھی ہیں۔ اور عوام بھی جنکے اعمال صالحہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو متوجہ کرنے والے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دیندار طبقہ کا ہمارے معاشرے پر کیا اثر ہوا ؟ اور ان صالحین کے ہوتے ہوئے ہمارے معاشرے میں اسقدر شدید اور اس قدر وسیع پیمانے پر فساد کیسے پیدا ہوگیا جو اللہ تعالیٰ کے اس عذاب شدید کا موجب بنا ؟ بلاشبہ اس زمانہ میں جبکہ دنیا فساد سے بھر گئی۔ ایسے معاشرے کا وجود جس میں گناہ و معصیت کا شمار اتفاقی حادثات میں شمار کیا جائے بہت مشکل ہے۔ لیکن ایسے معاشرے کا وجود بالکل ممکن ہے جس میں توبہ کرنے والوں اور گناہوں پر نادم ہونے والوں کی تعداد بھی عاصیوں اور گناہگاروں کے مساوی یا اس کے قریب قریب ہو، اگر ایک گروہ معصیت کے گندے نالے میں غوطہ لگاتا ہوا دکھائی دے تو دوسرا نادم و خجل ہو کر اس میں سے نکلتا ہوا بھی نظر آئے۔ گناہگاروں کی زندگی کا ایک پہلو تاریک ہو تو دوسرا اعمال صالحہ سے روشن بھی دکھائی دے۔ گویا ہمارا معاشرہ قرآنی زبان میں خلطوا عملاً صالحاً و آخر سیئا۔ اعمال صالحہ اور اعمال سیئہ دونوں کو ملا دیا ہے۔ (یعنی دونوں قسم کے اعمال کئے ہیں) کا مصداق ہو۔

یہ تو ممکن بھی ہے اور اس کے نمونے بھی موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ صالحین کی موجودگی میں اس درجہ پر کیوں نہیں رکا اور اس قدر پستی میں کیوں جا پڑا۔ ؟ جو شخص پاکستان کی ۲۵ سالہ تاریخ سے واقف ہے۔ وہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ بیرونی طاقتیں اور اندرونی منافق یا مسلم نما دشمنانِ اسلام نے جو ہمارے لئے مارِ آستین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فسق و فجور اور الحاد و زندقہ پھیلانے کی کتنی کوشش کی ہے اور ہمارے سُنی نوجوانوں کو برباد کرنے کے لئے کیا کیا جتن کئے ہیں۔ انہوں نے ہمیں برباد و گمراہ کرنے کیلئے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دئے۔ اور جب وہ اقتدار پر قابض ہوئے تو اپنے مناصب کی پوری طاقت ہماری قوم کو گمراہ کرنے پر صرف کر دی۔ یہی وہ مارِ آستین ہیں جنہوں نے غداری کر کے ہمیں اتنا شدید نقصان پہنچایا اور لاکھوں اہل سنت کا خون بہا کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ یہاں پہنچ کر ہمارے سامنے چند سوالات آتے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ منافقوں کے ان گروہوں کو اسقدر استطاعت کیسے حاصل ہوگئی کہ وہ ہماری قوم کو اس قدر پستی میں پہنچا دیں اور اس کے اخلاق و اطوار اس قدر بگاڑ دیں۔ ؟ یہ لوگ ایسے مناصب تک کیسے پہنچ گئے کہ ان کی غداری ہمارے لئے اس قدر تباہ کن ثابت ہوتی۔ ان میں اتنی بڑی غداری کی جراٴت کیوں ہوئی۔ ؟ جبکہ اغلب اکثریت ہماری ہے۔ یہی وہ سوالات ہیں

جن پر غور کرنے سے ہماری اس تباہی کا اصل سبب روشن ہو جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ خود ہم نے اس بارے میں کیا غلطی کی ہے۔ اس پر بحث کرنا میرا اصل مقصود ہے۔ کیونکہ غدر تو دوسروں نے کیا، فسق و فجور کی ترویج دوسروں نے کی۔ دوسرے کا فعل تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہمارے اختیار میں جو کچھ ہے وہ ہمیں کرنا چاہئے۔ دیکھنا یہی ہے کہ خود ہم سے کیا غلطی ہوئی، تاکہ اگر ممکن ہو تو اسکی کسی درجہ میں تلافی کر سکیں۔

——— کسی قوم کا آزاد مستقل وجود اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک اس کا ایک قومی و اجتماعی ذہن نہ ہو۔ اس کا قومی ذہن ہی اس کی بقاء اور اس کی آزادی کا ضامن ہوتا ہے۔ اور قوم کے افراد اجتماعی امور میں اسی ذہن سے سوچتے ہیں۔ اگر قوم میں مختلف فرقے ہوں اور اکثریت کا یہ ذہن بن جائے تو عموماً ذہنیتیں بھی اسی ذہن سے سوچنے پر مجبور ہوتی ہیں، ورنہ کم از کم انہیں اس کی رعایت کرنا پڑتی ہے۔ مثلاً انگلستان کا ایک قومی ذہن ہے جو نسل و وطن کے تصورات پر مبنی ہے، وہ اپنے اجتماعی مسائل کو اسی ذہن سے سوچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا شیرازہ بکھرنے نہیں پاتا، وہاں آپکو کوئی غدار نہ ملے گا۔ اس میں سیاسی پارٹیاں بھی ہیں اور ان کے درمیان کشمکش بھی، لیکن کوئی پارٹی اپنے ملک کے ساتھ غدر نہیں کرے گی۔ کیونکہ اول تو وہ اپنے قومی ذہن سے بے نیاز ہو کر سوچ ہی نہیں سکتی اور وہ بھی غدر کی اجازت نہ دے گا۔ دوسرے اگر بالفرض وہ سوچے بھی تو ملک کا قومی ذہن فوراً اس کا احساس کریگا اور اس کا خوف ایسے کبھی غدر کی جرأت نہ کرنے دیگا۔

تقسیم برصغیر سے پہلے ہی بھارت نے اپنا ایک قومی ذہن بنا لیا جو ہندو قومیت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوبائی، لسانی، نظریاتی ہر قسم کے کثیر اختلافات کے باوجود مسلمانوں کے مقابلے میں پوری ہندو قوم متحد ہے۔ دوران جنگ ان کے یہاں کوئی بھی ایسی تحریک نہیں پیدا ہوئی جو انہیں کمزور کر سکتی۔ نہ وہاں "بنگلہ دیش" کا نعرہ سنائی دیا۔ حالانکہ مغربی بنگال انہیں کے پاس ہے۔ اور نہ سکھستان کی صدا بلند ہوئی حالانکہ یہ موقع تھا کہ پاکستان کی امداد سے سکھوں کے اس خواب کی تعبیر نکل آتی۔

——— ہماری قومیت ہمارے دین پر مبنی ہے۔ اگر دین کو درمیان سے نکال دیجئے تو کوئی عنصر ایسا نہیں باقی رہتا جو پاکستان کے مختلف اجزاء اور صوبوں کو متحد رکھ سکے۔ اس لئے ہماری بقاء اور آزادی کے قیام کیلئے لازم ہے کہ ہمارا ذہن دینی ہو۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ۲۵ سال کی طویل مدت میں ہماری قوم کا دینی ذہن وجود میں نہ آسکا بلکہ اس کے جو آثار تحریک پاکستان کے وقت موجود تھے

وہ بھی برباد ہو گئے۔ مناسب یہ ہے کہ میں پہلے اس "دینی ذہن" کی تشریح کر دوں۔

۱ ــــ "دینی ذہن" کا مفہوم یہ ہے کہ انسان ہر مسئلہ کو دینی نقطۂ نظر سے دیکھے اور اس کے دینی مصالح اور مفاسد کو پیش نظر رکھ کر دنیاوی مصالح و مفاسد کو قانونی حیثیت دے۔ طرزِ فکر اور ذہنی انفرادی حیثیت میں بھی پایا جا سکتا ہے اور اجتماعی حیثیت میں بھی جہاں تک انفرادی حیثیت کا تعلق ہے۔ ہماری قوم میں ایسے افراد کی معتدبہ تعداد پائی جاتی ہے جو اپنی انفرادی زندگی میں یہی طرزِ فکر اور ذہن رکھتے ہیں اور اپنے ذاتی مسائل پر دین ہی کے نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں۔ لیکن جو چیز ہم میں مفقود ہو گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا قومی اور اجتماعی ذہن دینی نہیں رہا یعنی ہماری قوم جب اپنے اجتماعی مسائل پر غور کرتی ہے تو وہ خالص دنیاوی نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ اختیار کرتی ہے اور دنیاوی مصالح و مفاسد کو پیش نظر رکھ کر دینی مصالح و مفاسد کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ قوم کے "دینی ذہن" ہونے کا مطلب یہی ہے کہ قوم کے افراد خواہ اپنی انفرادی و شخصی زندگی میں بے راہ روی کے مرتکب ہوتے ہوں اور دنیاوی زاویۂ نظر سے غور و فکر کرنے کے عادی ہوں لیکن ایسے اجتماعی مسائل پر خواہ وہ سیاسی ہوں یا معاشی یا تعلیمی یا اور کسی قسم کے دینی زاویۂ نظر سے نظر کرنے کے عادی ہوں اور ہر اجتماعی معاملے کے بارے میں سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ اس کا اثر ہمارے دین پر کیا پڑتا ہے ــــ؟

یہاں یہ نکتہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ "قومی ذہن" کو "دینی" بنانے کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ قوم کا ہر فرد دیندار اور متقی ہو جائے۔ قوم میں فساق و فجار کی اکثریت کے باوجود قوم کا اجتماعی و قومی ذہن دینی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ان فاسقوں کا انفرادی ذہن دنیاوی ہو گا۔ مگر ان کا اجتماعی ذہن دینی ہی ہو گا۔ اور اجتماعی مسائل پر وہ اسی سے نظر کریں گے۔

ــــ یہ صرف امکان نہیں ہے بلکہ واقعہ بھی ہے۔ شواہد تو بہت ہیں۔ لیکن اسی برصغیر کی قریبی تاریخ کا مطالعہ تصدیق و تائید کے لئے کافی ہے۔ تحریک خلافت کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے ہیں۔ اسے دیکھنے والے بھی ابھی موجود ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں نے خلافت عثمانی کی حفاظت و بقاء کیلئے جان کی بازی لگا دی تھی۔ صرف اس لئے کہ اس کے زوال کو دینی نقصان سمجھتے تھے۔ دنیا کے اعتبار سے انہیں اس کا کوئی بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ قوم میں اس وقت بھی اکثریت فساق ہی کی تھی لیکن بحیثیت مجموعی قوم کا ذہن دینی تھا اس لئے اس نے اس اجتماعی مسئلہ کو اسی ذہن سے سوچا۔ اس سوچنے میں وہ لوگ بھی شریک تھے جن کا انفرادی

ذہن بالکل دنیاوی تھا۔ تحریک پاکستان کے وقت بھی اس "دینی ذہن" کی کارفرمائی ظاہر ہوتی۔ اسی وجہ سے تحریک میں ان مسلمانوں نے بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا جو آج بھی بھارت کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ اور ہندوؤں کے ماتحت رہنے پر مجبور ہیں۔ وہ اپنا انجام جانتے تھے مگر صرف دین کے فروغ کے لالچ میں انہوں نے تحریک میں پوری سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔

جس خطے پر پاکستان بنا ہے اس پر برطانوی ذہنی اور سیاسی اثرات بہت زیادہ تھے۔ یہ قوتیں مسلمانوں کے "دینی ذہن" کو ختم کرنے کیلئے ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں۔ تاہم تحریک پاکستان کے وقت مسلمانوں کے اس ذہن میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ اور زندگی کے آثار اس سے ظاہر ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ تحریک پاکستان دین کے نام پر شروع کی گئی تھی مگر قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں اسلام دشمنوں اور مار ہائے آستین بیرونی طاقتوں کی شہ سے اس ذہن کو ختم کر دینے کی کوشش شروع ہو گئی جو بہت ہوشیاری اور تسلسل کے ساتھ جاری رہی اور آج تک جاری ہے۔ چند ہی سال کے بعد یہ بات روشن ہو گئی کہ تحریک پاکستان کے وقت "دینی ذہن" کی انگڑائی درحقیقت اناقۃ الموت کے مترادف تھی۔ ایک سنبھالا لینے کے بعد مریض اس عالم سے رخصت ہو چکا ہے۔

_____ ہمارے دیندار طبقہ کا فرض تھا کہ وہ اپنی پوری قوت و طاقت اس دینی ذہن کی بازیافت اور تقویت کے لئے صرف کر دیتے۔ اس طبقہ سے میری مراد علماء و مشائخ کے علاوہ عام حضرات بھی ہیں جو دینی شعور رکھتے ہیں اور اپنی زندگی کو دین کے راستہ پر چلانے کی کسی درجہ میں کوشش کرتے ہیں۔ یہ ذمہ داری ہر اس شخص پر عائد ہوتی ہے جو دین کا شعور اور دوسروں تک اسے پہنچانے کا کچھ سلیقہ رکھتا ہے۔ لیکن حیف صد حیف کہ اس طبقہ نے اپنی ذمہ داری مطلقاً محسوس نہ کی بلکہ اجتماعی مسائل کو خود بھی غیر دینی اور خالص دنیاوی ذہن سے سوچنے لگا۔ صوبائی، قبائلی، طبقاتی، نسلی وغیرہ جاہلی عصبیتوں کا زہر اس کے دل و دماغ میں بھی سرایت کر گیا۔

_____ قومی ذہن کا سب سے نمایاں اور قوی اثر سیاست میں ظاہر ہوتا ہے پاکستان کی پچیس سالہ سیاسی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈال جائیے۔ آپ محسوس کریں گے کہ ہمارے سیاسی قائدین نے کسی سیاسی اقدام یا حادثہ پر دینی زاویۂ نظر سے غور نہیں کیا۔ بلکہ ان کی سیاست خالصتاً دنیاوی رہی صرف دنیادار لیڈروں کا اگر یہ حال ہوتا تو کچھ صبر بھی آجاتا۔ مگر یہ افسوسناک حقیقت کس طرح بھلا دی جائے کہ یہی کیفیت ان سیاسی قائدین کی بھی ہے جو اپنی انفرادی زندگی میں بہت دیندار اور متقی ہیں۔ گھٹیا درجہ کے دنیاوی مقاصد ان کے پیش نظر رہے۔ دین کے تحفظ اور اس کی ترویج کی انہیں

کوئی فکر نہ ہوئی نہ کبھی انہیں اس کا خیال آیا کہ ہمارے فلاں سیاسی اقدام کا عام مسلمانوں کے دین پر کیا اثر پڑے گا ؟ یا فلاں سیاسی حادثے سے ہمارا دین کیا اثر لے گا ؟ اس حالت کو اخلاص و للہیت سے نسبت تضاد حاصل ہے۔ اگر ہمارے سیاسی قائدین مخلص ہوتے اور اپنی سرگرمیوں کا محور رضائے الٰہی اور دین حق کے فروغ کو بناتے تو اس ادبار کا منحوس چہرہ ہمیں نہ دیکھنا پڑتا۔

—— علماء کرام امت کے دینی نگران ہیں۔ یہ منصب انہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوتا ہے۔ اس سے نہ انہیں کوئی معزول کر سکتا ہے۔ نہ وہ خود اس سے مستعفی ہو سکتے ہیں۔ ان کی نظر ہر وقت امت کے دینی مصالح و مفاسد پر رہنا چاہیئے اور انہیں اس بارے میں سب سے زیادہ حساس ہونا چاہیئے۔ مگر ہماری محرومی دیکھئے کہ یہ جماعت بھی اس معاملہ میں غفلت کا شکار ہو گئی اور انہوں نے بھی اجتماعی تغیرات کا مطالعہ دینی ذہن سے نہیں کیا اور نہ امت کے ذہن کو دینی بنانے کی کوشش کی۔ ان کی کیفیت یہ رہی کہ انہیں بریلویت، دیوبندیت، حنفیت و غیر مقلدیت کی حفاظت کی تو فکر ہوئی۔ لیکن خود "سنیت" کی حفاظت کی کوئی فکر نہ ہوئی۔ حالانکہ بریلوی و دیوبندی اختلاف کا درجہ ایسا ہی ہے جیسے دو بھائیوں میں اس بات پر اختلاف ہو کہ باپ سے کون زیادہ محبت کرتا ہے۔ دونو مکتب فکر کے حضرات "سنی" ہونے کے مدعی ہیں۔ اور زمرہ اہلسنت سے نکلنے کیلئے کوئی بھی تیار نہیں ہے۔ لیکن باوجود اس کے خود مسلک اہل سنت والجماعت کی حفاظت کی ان میں سے کسی نے بھی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ اس کے لئے خطرات شروع ہی سے موجود تھے اور اسے ختم کرنے کی کوششیں کھلم کھلا ہو رہی تھیں۔ حنفیت و غیر مقلدیت کا اختلاف تو اس سے بھی ادنیٰ درجہ کی چیز ہے۔ لیکن یہ بھی حدود سے تجاوز کر گیا۔ یہی اختلافات کیا کم تھے۔ کہ علماء کے درمیان سیاسی اختلافات بھی پیدا ہو گئے۔ اور انہوں نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ اخلاقی و شرعی حدود کو پار کر لیا۔ اس چیز نے رہے سہے اتحاد کو بھی ختم کر دیا۔ یہ اختلافات بھی درحقیقت "دینی ذہن" کے فقدان اور خالص "دنیاوی ذہن" سے سیاسی مسائل کو سوچنے کا نتیجہ تھا۔ اگر دینی ذہن" موجود ہوتا اور ہم اپنے مسائل اسی اجتماعی و قومی ذہن "کے سامنے پیش کرتے تو یہ اختلافات پیدا ہی نہ ہوتے اور اگر ہوتے تو حدود سے متجاوز ہو کر مضرت رساں نہ بنتے۔

—— ظاہر ہے کہ جب اجتماعی مسائل کے بارے میں ہمارے علماء و صلحا کا ذہن بھی "دینی" نہیں تھا تو عوام کا ذہن دینی کس طرح بن سکتا تھا۔ اور ہمارے قومی ذہن کی تعمیر کیسے ہو سکتی تھی ؟

(باقی آئندہ)

مکتوب بنام مدیر

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب
شیخ الحدیث ٹنڈو الہ یار سندھ

غالباً اسلام میں پہلا واقعہ

سقوطِ مشرقی پاکستان

مشرقی پاکستان کے المیہ کے بارے میں اپنے تاثرات کیا عرض کروں، میں وہاں ڈھاکہ میں تقریباً ۱۵، ۱۶ سال رہا ہوں۔ میرا اپنا قائم کیا ہوا مدرسہ جامعہ قرآنیہ لال باغ ڈھاکہ میں ہے۔ میرے شاگرد اور متعلقین وہاں بہت ہیں مجھ پر مشرقی پاکستان کے بھارت کے ہاتھ میں جانے کا جتنا بھی صدمہ ہو کم ہے۔ ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ اور عوامی لیگ میں الیکشن ہوا تھا جس میں عوامی لیگ کامیاب ہوگئی۔ مسلم لیگ کو شکست ہوئی۔ میں اس وقت مدرسہ عالیہ ڈھاکہ میں مدرس اوّل تھا۔ ساڑھے سات سو روپیہ تنخواہ پاتا تھا، مگر عوامی لیگ کی کامیابی سے مشرقی پاکستان سے میں دل برداشتہ ہوگیا۔ ۱۹۵۴ء میں حج کو گیا۔ حج سے واپس ڈھاکہ آیا اور ڈھاکہ سے اکتوبر ۱۹۵۴ء میں مغربی پاکستان دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ یار میں چار سو روپیہ تنخواہ پر چلا آیا۔ پرنسپل مدرسہ عالیہ ڈھاکہ نے بہت کہا کہ میں مدرسہ عالیہ کو نہ چھوڑوں میں نے کہا کہ قاعدہ سے مجھے ریٹائر ہو جانا چاہیئے کیونکہ پچپن سال سے زیادہ عمر ہو چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے لئے توسیع کرا دیں گے۔ علماء حدیث کیلئے ایسا ہوتا رہا ہے۔ مولانا محمد حسین صاحب سلہٹی دس سال پہلے پچپن سال کے ہو چکے تھے مگر برابر توسیع دی جا رہی ہے آپ کے بھی قویٰ اچھے ہیں۔ آپ کو توسیع ضرور دی جائے گی۔ مگر میں نے کہا کہ اب دل برداشتہ ہو گیا ہوں، اب تو مغربی پاکستان ہی جانے دیا جائے۔ چنانچہ اب ۱۷ سال سے ٹنڈو الہ یار کے دارالعلوم الاسلامیہ میں قیام ہے۔ اسوقت جب عوامی لیگ کامیاب ہوئی میں حج کو چلا گیا تھا۔ وہاں ایک عالم بزرگ کا خط ملا۔ کہ مشرقی پاکستان میں بڑا سخت طوفان آیا ہے۔ دعا کیجئے یہ عالم بزرگ عوامی لیگ کے حامیوں میں سے ہے۔ میں نے مکہ ہی سے جواب لکھا۔ اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست۔ مولانا یہ سخت طوفان اور بلا آپ ہی کی لائی ہوئی ہے۔ آپ نے عوامی لیگ کو کامیاب کیا، اسکے یہ آثار ہیں۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ پھر اس کے بعد بھی سخت طوفان آئے اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں الیکشن ہوا جس میں انتخاب مخلوط نے عوامی لیگ کو کامیاب کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے کہ مشرقی پاکستان بھارت کے قبضہ میں چلا گیا۔ بانوے ہزار فوج نے ہتھیار ڈال دئے۔ یہ غالباً اسلام میں پہلا واقعہ ہے۔ مگر سنا گیا ہے کہ ہماری فوج نے ہتھیار نہیں ڈالے جنرل نیازی برابر ہتھیار ڈالنے سے انکار کرتا رہا اور فوج بھی انکاری تھی مگران کو ایوان صدر نے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اضافے: ۱۔ مضمون حسب ارشاد ارسال کر چکا ہوں، اس میں ابتداء میں، جہاں میں نے مشرقی پاکستان سے اپنے تعلقات کا ذکر کیا ہے، وہاں اتنا اور بڑھا دیجئے گا کہ ۱۴؍ اگست ۱۹۴۷ء مطابق آخری جمعہ ۲۷؍ رمضان المبارک کو ڈھاکہ میں پرچم پاکستان میں نے ہی لہرایا تھا۔ اور سلہٹ ریفرنڈم کی کامیابی اللہ تعالیٰ نے میرے ہاتھ پر رکھی تھی۔ ڈھاکہ جب تک رہا وہاں کے حکام اور وزراء میرا بہت احترام کرتے تھے۔ ڈھاکہ گویا میرا گھر بن گیا تھا۔ میں حالانکہ اب لمبے سفر سے معذور ہو گیا ہوں۔ مگر ڈھاکہ جانے سے میں نے کبھی انکار نہیں کیا جب وہاں کے احباب نے بلایا میں بے تکلف چلا گیا۔ وہاں کے سفر سے انشراح خاطر ہوتا تھا۔

۲۔ میرے مضمون پر یہ سوال ناظرین کے دل میں پیدا ہوگا کہ عوامی لیگ کی کامیابی سے میرا دل مشرقی پاکستان سے برداشتہ کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنگالی غیر بنگالی اور اردو دشمنی عوامی لیگ نے پیدا کی، ورنہ میں سولہ سال بنگال میں رہا۔ بنگالیوں نے ہمیشہ ہماری اردو تقریر شوق سے سنی۔ بجائے ترجمہ بھی بنگلہ میں ہوتا تھا مگر ترجمہ کا تقاضا نہیں ہوتا تھا۔ عوامی لیگ کے کامیاب ہونے کے بعد دس پندرہ منٹ اردو تقریر ہوئی اور آواز آنے لگی بنگلہ بولو۔

عوامی لیگ نے علماء سے نفرت پھیلائی اس کا نعرہ تھا۔ ملا کو نہ گول ٹوپی نہیں چاہئے۔ یہ علماء کا لباس تھا جس سے بیزاری ظاہر کی گئی۔ پھر چاٹگام میں غیر بنگالی مسلمانوں پر حملہ کیا گیا۔ ڈاکٹر خورشید جو کوکا نوٹ بنانے کا ماہر تھا، قتل کیا گیا۔

— ظفر احمد عثمانی —

اگر ریشمی رومال افغانستان پہنچ جاتا

الوینا اقبال

آزادی کی قیمت

جیسے
تیسے
لٹے

اسلاف نے متاعِ زندگی نچھاور کر دی

مگر ہم نے سات کروڑ مسلمانوں کو غلامی کا طوق پہنا دیا

★

معرکہ بالاکوٹ اور انقلاب ۱۸۵۷ کے بعد آزادیِ ہند کے لئے تیسری سب سے بڑی منظم اور موثر تحریک "تحریک ریشمی رومال" کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس خونچکاں جدوجہد کی بے مثال منصوبہ بندی کا سہرا بھی تاریخی روایات کے مطابق علمائے حق کے سر ہی تھا۔ اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو غیر منقسم برصغیر کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ آج بھی آزادی کی تڑپ رکھنے والے حریت پسند سوچتے ہیں کہ .... اگر ریشمی رومال افغانستان پہنچ جاتا۔

سولھویں صدی کا حیدرآباد (سندھ) ہے۔ قدیم طرز کے مکان میں ایک شخص پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس سوئی دھاگا لئے ایک زرد رنگ کا رومال جس کی لمبائی ایک گز ہے اور عرض بھی اتنا ہی ہے گدڑی میں سی رہا ہے۔ وضع قطع اور صورت شکل سے درویش نظر آتا ہے۔ اچانک ایک دھماکا سا ہوتا ہے، وہ سر اٹھا کر دیکھتا ہے، چند گورے اور سکھ فوجی صحن کی دیوار پھاند کر اسکی طرف لپکے آ رہے ہیں وہ گدڑی اٹھا کر کمرے کے پچھلے دروازے کی طرف بھاگنے لگتا ہے لیکن فوجی سر پر پہنچ جاتے ہیں اور اس سے گدڑی چھین لیتے ہیں۔ وہ شخص ان کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے اور صحن میں پہنچ کر دیوار پھاند لیتا ہے۔ چند فوجی اس کے پیچھے جاتے ہیں۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہاتھ ملتے لوٹ آتے ہیں۔

یہ درویش آزادیِ ہند کی انقلابی پارٹی کے سرگرم اور سرفروش رکن اور پارٹی کے قائد شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کے قابلِ اعتماد پیروکار شیخ عبدالرحیم تھے۔ اچاریہ کرپلانی کے حقیقی بھائی اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے ہاتھ پر حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

پارٹی کا مرکزی دفتر پہلے دیوبند میں تھا۔ بعد میں دہلی منتقل کیا گیا۔ تحریک کا نام جس کی بنا پر

پارٹی تشکیل دی گئی تھی، پہلے ثمرۃ التربیۃ اور پھر جمعیت الانصار رکھا گیا تھا۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ حکومت وقت کے خلاف ملک بھر میں عام بغاوت کرائی جائے اور ساتھ ہی شمال مغربی سرحد کی طرف سے قبائل اور ترکی کی فوج سے حملہ کرایا جائے اس طرح ملک کو فرنگی استبداد سے آزاد کرانا تھا منصوبے کے مطابق ترکی کی فوج کو افغانستان کے راستے حملہ آور ہونا تھا، اس لئے افغانستان کی حکومت کو بھی جس کا سربراہ حبیب اللہ خان تھا۔ ہموار کرنا تھا۔ ترکی سے یہ طے کیا جا رہا تھا کہ اس کی فوج ہندوستان کو آزاد کرا کے لوٹ جائے گی۔ اس مدد کے عوض آزاد ہندوستان اس کی اخلاقی اور مالی مدد کرتا رہے گا۔ ترکی کے حکمران غازی انور پاشا تھے۔

اس طریقۂ کار پر عمل کرنے کے لئے دس جامع منصوبے ۱۹۰۵ء میں بنائے گئے تھے۔ ان کی تکمیل ۱۹۱۴ء میں ہوتی منصوبے یہ تھے: ہندو مسلم مکمل اتحاد، علمائے فکر قدیم اور جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اشتراک فکر و عمل، اقوام عالم سے اخلاقی مدد کا حصول جنگی نقشوں کی تیاری۔ انقلاب کے بعد عبوری حکومت کے خاکے کی ترتیب، بغاوت کے خفیہ مرکزوں کا قیام، بیرون ملک امدادی مراکز کا تعین، ترکی کی حمایت کے لئے دوسرے ملکوں سے رابطہ، باہر سے حملے کے لئے راستوں کی نشاندہی بیک وقت بغاوت اور حملے کے لئے تاریخ کا تعین۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے معرکہ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے خونچکاں اقدامات کے بعد یہ تیسری سرفروشانہ تحریک تھی جو تحریک ریشمی رومال کے نام سے تاریخ کے صفحوں پر انمٹ نقوش چھوڑ گئی پہلی تحریک مسلمانوں کے جاہلانہ تغافل سے ناکام ہوئی، لیکن دوسری اور تیسری تحریکیں ان کے مجرمانہ عدم تعاون اور کھلے بندوں غداری سے ملیامیٹ ہوئیں۔ یہ ایک ناقابل فراموش حقیقت ہے کہ تینوں تحریکوں میں بنیادی اور مرکزی کردار علمائے حق نے ادا کئے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء میں عام مسلمانوں کا حصہ زیادہ ہے۔ لیکن دوسری دونوں تحریکوں کا سہرا تمام تر علمائے حق کے سر ہے۔

تحریک ریشمی رومال کی کامیابی اپنوں کی متوقع غداری اور انگریزوں کے طے شدہ حفظ ماتقدم کے باوجود یقینی تھی۔ وجہ یہ کہ بیرونی امداد کے امکانات دسترس میں تھے۔ ۱۸۵۸ء میں سامراجیت کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے براہ راست حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں منتقلی کے بعد خارجی انگریز دشمنی کے دور کا آغاز ہو چلا تھا۔ بعید نہ تھا کہ یہ خارجی نیک فال داخلی جدوجہد کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتا۔ برطانیہ کی توسیع پسندی کے پیش نظر ۱۸۶۵ء میں دوار آف بھوٹان پر قبضہ کیا گیا اور برما کے شمالی حصے کو فتح کر کے سلطنت میں شامل کیا گیا ۱۸۸۶ء میں تبت اور چین پر حملہ کیا گیا اور سرحد کے مجاہدین

پر فوج کشی ہوئی ۱۸۷۸ء میں کابل پر حملہ کیا گیا۔ ۱۸۹۰ء میں حکومت منی پور پہ تسلط کیا گیا۔ ۱۸۹۵ء میں چترال پر قبضہ ہوا۔ ۱۸۹۶ء میں تیراہ پہ حملہ کیا گیا ۱۸۹۷ء میں دوبارہ سرحدی مجاہدین کے خلاف چھ مہمیں بھیجی گئیں۔

بیرونی امداد کے سلسلے میں حکومت ترکی سے توقع کسی خوش فہمی اور جذباتیت کی بنا پہ نہیں تھی اس کے پس منظر میں ٹھوس حقائق اور دلائل تھے۔ ترکی ، برطانیہ کا زخم خوردہ تھا۔ اگر مذہب اور حریت پسندی ہندوستان اور ترکی میں قدر مشترک نہ ہوتی تب بھی سیاسی ————— طور پر ترکی کی طرف سے مدد لازمی تھی۔ ۱۸۳۹ء میں انگریزوں نے سلطان عبدالمجید خان کو محمد علی پاشا کی بغاوت کے خلاف مدد دی اور اس کے عوض میں پہلے عدن کی بندرگاہ اور پھر سارے عدن پہ قبضہ کر لیا اس قبضے کی وجہ سے آنے والے برسوں میں جو نتائج نکلے وہ تصور میں لائے جا سکتے ہیں (اس مد کا سارا خرچ (بیس لاکھ پونڈ) ہندوستان کے ذمے قرض کے طور پہ ڈالا گیا) ۱۸۷۸ء میں باب عالی سلطان عبدالمجید خان سے خفیہ معاہدہ کر کے جزیرۂ قبرص قبضے میں کیا گیا۔ اس کے بھی دوررس نتائج نکلے۔ اسی سال برلن میں یورپی ملکوں کی کانفرنس ہوئی جس میں ترکی کے حصے بخرے کر کے آپس میں بانٹ لیے گئے۔ برطانیہ بھی حصے دار بنا۔ ۱۸۷۸ء میں رومانیہ ، بلغاریہ ، کریٹ ، سرویا ، مولڈویا ، ولاچیا ، البوسنیا ، مونٹی نیگرو اور ارضی گونیا کو ترکی کے قبضے سے نکلوا دیا۔ ۱۹۰۴ء میں برطانیہ کی شہ پہ فرانس نے مراکش پہ قبضہ کر لیا۔

۱۹۰۸ء میں ترکی میں فوجی انقلاب رونما ہوا۔ یہ انقلاب فوجیوں کی تنظیم "اتحاد المسلمین" نے برپا کیا تھا جس کے قائد غازی انور پاشا تھے۔ بعد میں یہی حکومت کے سربراہ بنے ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان میں ہندوستان کی حریت پسند تحریکوں نے ترکی کی جو اخلاقی اور مالی مدد کی تھی ، اسے انور پاشا بھولے نہیں تھے۔ اسی لئے تحریک ریشمی رومال کو ترکی کے سربراہ کی حیثیت سے ان کی مدد غیر متوقع نہیں تھی۔

تحریک کے پہلے دو منصوبوں کے لئے فضا پہلے ہی سازگار تھی۔ ہندو اور مسلمان حریت پسندوں میں ذہنی ہم آہنگی اور اشتراک عمل کا جذبہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے وقت ہی سے پیدا ہو چکا تھا۔ اور اس کا مظاہرہ بار بار خصوصاً ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد ہو چکا تھا —————

————— تحریک کے عملی قائد شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ اور راجہ مہندر پرتاپ تھے لیکن اس کے قیام اور ساری منصوبہ بندی میں جن شخصیتوں کا ہاتھ تھا ان میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ ، مولانا شوکت علیؒ ، مولانا ابوالکلام آزادؒ ، مولانا عبید اللہ سندھی ، مسٹر گاندھی ، ڈاکٹر انصاری ، موتی لال نہرو ، لاجپت رائے اور راجندر پرشاد شامل تھے۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب نے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک کھیپ مہیا کر دی تھی جن کے دلوں میں حریت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں اور ذہن جدید

طبقاتی تقاضوں سے روشناس تھے۔ ان نوجوانوں میں جن لوگوں کو اہم فرائض سونپے گئے، ان میں پروفیسر برکت اللہ ایم اے (انگریزی) تھے جنہیں ترکی، جرمنی اور جاپانی زبانوں پر عبور حاصل تھا، چوہدری رحمت علی گریجویٹ، لالہ ہردیال ایم اے، کامریڈ متھرا سنگھ گریجویٹ، مولوی محمد علی قصوری گریجویٹ، میاں عبدالباری ایم اے، رام چندر گریجویٹ، بمبئی کے شیخ محمد ابراہیم ایم اے اور چینی زبان میں ماہر بنگال کے شوکت علی گریجویٹ وغیرہ شامل تھے۔

تیسرے منصوبے کے تحت چین، جاپان، فرانس، برما اور امریکہ میں کام شروع کیا گیا۔ اس کے لئے مشنری طریقۂ کار اپنایا گیا۔ پہلا مشن دیوبند سے فارغ التحصیل مولانا مقبول الرحمٰن سرحدی اور شوکت علی کی سرکردگی میں چین بھیجا گیا جس میں چھ اور افراد بھی شامل تھے۔ مشن میں ہندو ارکان بھی تھے، لیکن چین میں ایک مرکزی سیرت کمیٹی قائم کرکے ہنک چو میں اس کی شاخیں کھول دی گئیں۔ اردو اور چینی زبانوں میں ایک رسالہ "الیقین" جاری کیا گیا۔ ان کاموں میں مشن کو بڑی کامیابی ہوئی جس سے مسلمانوں کی خاصی تعداد ہندوستان کی صورت حال سے متاثر ہوئی

اور انگریز سامراجیت سے چھٹکارا دلانے میں ہر ممکن اخلاقی مدد کا وعدہ کیا۔ ہرچند کہ چینی عوام خود ظلم واستبداد کی چکی میں پس رہے تھے، حکومت کی سطح پر کوئی نمایاں کام نہ ہو سکا کیونکہ ملک پر سامراجیت کے دوسرے روپ شہنشاہیت اور جاگیرداری کا تسلط تھا۔ مشن نے اپنے اخراجات اس طرح پورے کئے کہ ایک شفاخانہ کھول لیا۔ مولانا مقبول الرحمٰن طبابت اور شوکت علی ڈاکٹری کرتے تھے۔

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۹ء تک چین میں کام کرنے کے بعد دونوں صاحبان کو برما جانے کا حکم ملا۔ مشن کے تین ارکین کو چین میں کام کی نگرانی کے لئے چھوڑا گیا۔ شفاخانے کو فروخت کرکے ان کے گزارے کے لئے رقم دی گئی اور سفرخرچ بھی نکالا گیا۔ ایک آدمی کو واپس ہندوستان بھیجا گیا اور چار آدمی جن میں دو ہندو تھے، برما پہنچے۔ وہاں کپڑے کا کاروبار شروع کیا گیا جس میں کافی منافع ہوا۔ برما میں مذہبی طریقۂ کار اپنانے سے کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، لہٰذا انسانی رشتے کو مقصد کا حصول بنایا گیا اور انسانی برادری کے نام سے ایک انجمن بنائی گئی جس کا نصب العین انسانی فلاح وبہبود بتایا گیا۔ مولانا مقبول الرحمٰن نے عربی زبان میں ایک کتاب "الانسان" لکھی اور اس کا انگریزی اور برمی زبانوں میں شوکت علی نے ترجمہ کیا۔ مشن ۱۹۱۶ء تک بڑی کامیابی سے اپنا کام کرتا رہا۔ اس نے ہزاروں افراد کو ہندوستان کے انسانی مسائل سمجھنے پر آمادہ کیا۔ ہندوستانیوں کی اخلاقی مدد کے لئے ایک مخلص حلقہ پیدا ہو گیا۔ شومئ قسمت سے ۱۹۱۶ء میں تحریک ناکام ہو گئی شوکت علی اور دونوں ہندو ارکین ہندوستان چلے

گئے اور مولانا مقبول الرحمٰن رنگون جا پہنچے (شوکت علی ہندوستان سے فرار ہو کر برلن چلے گئے اور مولانا مقبول الرحمٰن ۱۹۲۳ء میں وطن لوٹے)

دوسرا مشن جاپان بھیجا گیا، اس میں پانچ آدمی تھے اور قائد پروفیسر برکت اللہ تھے۔ انگریزی ترکی، جرمنی زبانوں کے علاوہ جاپانی زبان میں بھی مہارت رکھنے کی وجہ سے انہیں ٹوکیو کے ایک کالج میں پروفیسری مل گئی۔ مشن نے اسلامک فریٹرنٹی کے نام سے ایک انجمن بنائی اور اسی نام سے انگریزی اور جاپانی زبانوں میں رسالہ نکالا جس کے مدیر پروفیسر صاحب تھے۔ ترکی کی طرح جاپان سے بھی بھرپور مدد کی توقع تھی کیونکہ جاپان، برطانیہ کے سخت خلاف تھا۔ اسی مخالفت کی بنا پر اس نے دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ پر حملہ کیا تھا۔ مشن کو یہاں کامیابی سے ہمکنار ہوتا دیکھ کر ۱۹۱۰ء میں پروفیسر برکت اللہ کو چوہدری رحمت علی کی مدد کے لئے فرانس جانے کا حکم ملا۔ یہاں چوہدری صاحب نے ملازمت چھوڑ دی، اخبار بند کر دیا اور ایک ساتھی کو لے کر فرانس کی طرف روانہ ہوئے

فرانس کے مشن میں چوہدری رحمت علی کے ساتھ دو آدمی تھے ان میں ایک گریجویٹ رام چندر نہایت قابل نوجوان تھا۔ پروفیسر برکت اللہ نے انگریزی زبان میں ایک اخبار انقلاب جاری کیا اور تندہی سے کام کرنے لگے۔ یہ اخبار مشن کی تشکیل کردہ غدر پارٹی کا ترجمان تھا۔ رولٹ رپورٹ میں اخبار کا نام بھی غدر لکھا گیا ہے، جو غلط ہے۔ فرانس میں چھ سال تک کام ہوتا رہا۔ عوامی سطح پر غدر پارٹی کی بہت حوصلہ افزائی کی گئی اخلاقی مدد کے بھی روشن امکانات تھے لیکن حکومت کی طرف سے کوئی امید نہیں تھی۔ جو کچھ حاصل ہوا اسی پر اکتفا کر کے پروفیسر برکت اللہ اور چوہدری رحمت علی کو امریکہ جانے کا حکم ملا۔

امریکہ میں لالہ ہردیال کی سربراہی میں چھ آدمیوں پر مشتمل مشن کام کر رہا تھا۔ پروفیسر صاحب اور چوہدری صاحب کی شمولیت سے تعداد آٹھ ہو گئی۔ یہاں بھی غدر پارٹی کام کر رہی تھی۔ ان دونوں حضرات کے آنے کے بعد پروفیسر صاحب کی ادارت میں غدر نام سے ایک اخبار نکالا۔ دراصل واشنگٹن کے اسی اخبار کا مغالطہ رولٹ کمیٹی کو ہوا تھا چوہدری رحمت علی کی سکونت تو پیرس میں تھی لیکن وہ واشنگٹن آتے جاتے رہتے تھے اور وہاں کچھ زمین بھی خرید لی تھی۔ انہوں نے اسے بیچ کر ایک ہوٹل کھول لیا۔ اس کے ایک کمرے میں پارٹی کا اور دوسرے کمرے میں اخبار کا دفتر قائم کیا گیا۔ ہوٹل کی آمدنی سے اخراجات پورے ہوتے رہے، اور یہ پہلے ہردیال اور پھر چوہدری صاحب کی نگرانی میں چلتا رہا۔ اس کے علاوہ پارٹی والوں نے رنگوں کا کاروبار بھی شروع کر رکھا تھا۔ اس سے آمدنی بھی تھی اور دہلی کے مرکز سے

رابطہ بھی قائم تھا۔ دہلی کے چار مسلمان اور تین ہندو، پشاور کے دو مسلمان اور ایک ہندو، لاہور کے دو مسلمان اور پانچ ہندو، بمبئی کا ایک مسلمان اور چار ہندو، کلکتہ کے چار ہندو ایک مسلمان، ڈھاکہ کے دو ہندو ایک مسلمان اور کراچی کا ایک ہندو ان لوگوں سے مال منگاتے تھے۔ اور کاروبار کی آڑ میں مرکز کو رپورٹیں بھیجی اور ہدایات حاصل کی جاتی تھیں۔ ہندوستان میں تحریک کے ناکام ہونے کی خبر ملی تو ہوٹل فروخت کر دیا گیا اور اخبار بھی بند کر دیا گیا۔ مشن کے ارکین پیرس چلے گئے۔ وہاں سے جنیوا اور برلن ہوتے ہوئے افغانستان پہنچے اور وطن آگئے۔

انقلابیوں کا چوتھا منصوبہ جنگی نقشوں کی تیاری تھا۔ اس منصوبے کو تین شکلیں دی گئیں۔ پہلی شکل تھی بیرونی حملے کے لئے راستوں اور محاذوں کی تفصیلی نشاندہی کرنا۔ حملہ آور فوج کے لئے رسد رسانی اور اس کے اپنے ہیڈکوارٹر سے رابطے اور انقلابی رضاکاروں سے رابطے کے لئے پیغام رسانی کا انتظام کرنا اور حملہ آور فوج کی نقل وحرکت کے لئے سہولت فراہم کرنا۔ دوسری شکل یہ تھی کہ سی آئی ڈی کے آدمیوں سے تعاون حاصل کیا جائے اور اس محکمے میں اپنے آدمی داخل کئے جائیں۔ تاکہ حکومت کی پالیسیوں اور ارادوں کی خبر ملتی رہے۔ تیسری شکل تھی فوج میں اپنے ہم خیال بنانا اور انقلابی کارکنوں کو فوج میں بھرتی کرانا تاکہ جب حملہ ہو تو دشمن کو سبوتاژ کیا جاسکے۔

پہلا کام مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو سونپا گیا اور بمبئی کے شیخ محمد ابراہیم ایم اے کو ان کا مددگار بنایا گیا۔ مولانا نے شمال مغربی سرحد کے کئی دورے کئے، جغرافیائی پوزیشن کا بنظر غائر معائنہ کیا۔ فنونِ حرب سے آگاہی کے لئے انگریزی، جرمنی، ترکی، فرانسیسی اور عربی زبانوں کی کتابیں منگوا کر ان کا مطالعہ کیا، قدیم اور جدید طریقوں کو پرکھا، اور متواتر سات سال تک کام کرنے کے بعد جنگ اور اس کے محاذوں کا ایک فقید المثال نقشہ تیار کیا۔ ان کے مطالعے سے بعد میں ترکی، جرمنی اور افغان فوجی افسروں نے بھی استفادہ کیا۔ مولانا سے تربیت یافتہ نوجوانوں نے والیٔ افغانستان امیر امان اللہ خان اور انگریزوں کے مابین جنگ میں افغان فوج کی ناقابلِ فراموش رہنمائی کی۔

دوسرے کام کی سربراہی ڈاکٹر انصاری نے انجام دی۔ بہت سے ہندو اور مسلم نوجوان سی آئی ڈی میں گھس گئے اور حکومت کے راز قائدینِ تحریک تک پہنچاتے رہے۔ تحریک کی ناکامی کے بعد کئی نوجوان پکڑے گئے۔ اور پھانسی پر لٹکائے گئے تیسری شکل کے تحت منتخب نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کرایا گیا۔ انہوں نے حب الوطن فوجیوں کو اپنا ہم خیال بنایا۔ بعض پکڑے بھی گئے اور کچھ لوگ تحریک کی ناکامی کے بعد بھی رہے اور پہلی جنگ عظیم کے بعد فوج سے نکل گئے۔ بعض ایسے بھی تھے جو

مستقل طور پر فوج میں رہے اور دوسری جنگ عظیم میں دوسرے افراد کو اپنے ساتھ ملا کر آزاد ہند فوج کے روپ میں سامنے آئے۔

پانچویں منصوبے کے تحت انقلاب کے بعد قائم ہونے والی عبوری حکومت کا خاکہ یہ بنایا گیا کہ ایک ہندو اور ایک مسلمان پر مشتمل ایک اعلیٰ اختیارات کی کونسل ہوگی۔ مسلمان رکن کے لئے شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کا نام تھا۔ ہندو رکن کا نام تحقیق طلب ہے۔ (سی آئی ڈی کی رپورٹ میں گاندھی جی بتایا گیا ہے۔ جو غالباً صحیح نہیں ہے۔) کونسل کے تحت صدر، وزیر اعظم، وزیر مملکت اور ان کے ماتحت کابینہ ہوگی۔ ان عہدوں کے لئے مجوزہ افراد علی الترتیب راجہ مہندر پرتاپ، پروفیسر برکت اللہ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ تھے۔ انہی لوگوں کو کابینہ بنانا تھی۔ فوج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے حضرت شیخ الہندؒ کا نام تھا۔ جرنیلوں کی تعداد بارہ رکھی گئی تھی۔

چھٹا منصوبہ بغاوت کے خفیہ مراکز کے قیام کا تھا۔ ہیڈ کوارٹر دہلی میں بنایا گیا، اس میں شیخ الہندؒ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبید اللہ سندھی، ڈاکٹر انصاری، گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، لالہ جپت رائے اور بابو راجندر پرشاد وغیرہم صف اول کے لوگ تھے۔ ہیڈ کوارٹر کے تحت آٹھ شاخیں پانی پتؒ (یوپی کے اضلاع) لاہور (پنجاب) راندیرؒ (بمبئی گجرات کاٹھیاواڑ مہاراشٹر) کراچیؒ (قلات لاس بیلہ وغیرہ) امان زئی (شمالی سرحد) دین پورؒ (بہاولپور) اور ترنگ زئی (آزاد قبائل) امروٹؒ (سندھ میں) کام کرتی تھیں۔ ان شاخوں کے امیر علی الترتیب مولانا احمد اللہ، مولانا محمد احمد، مولانا محمد ابراہیم، مولانا محمد صادق، خان عبد الغفار خان، مولانا غلام محمد، مولانا فضل واحد اور مولانا تاج محمد تھے۔ مرکز میں ہندو ارکین کی موجودگی کے باوجود کسی شاخ کا سربراہ ہندو نہیں تھا ان میں سے صرف مولانا احمد اللہ اور مولانا محمد احمد نے گرفتار ہونے پر انگریزوں سے معافی مانگ لی تھی۔ بعض ذرائع کے مطابق شمال مغربی سرحد اور بنگال میں بھی شاخیں تھیں۔ بنگال میں مولانا ریاض احمد اور شمال مغربی سرحد میں تین علماء کی مشترکہ کمان تھی۔ کہا جاتا ہے کہ چند سال بعد جب آزاد قبائل اور انگریزوں کی خونریز جھڑپیں ہوئیں اور انگریزی فوج کو پے در پے ہزیمت اٹھانی پڑی، تو یہ اسی کمان کا کارنامہ تھا۔

ساتویں منصوبے یعنی بیرون ملک امدادی مراکز کے قیام کی سمت میں ہیڈ کوارٹر کابل میں تھا۔ یہاں کے سربراہ راجہ مہندر پرتاپ تھے بعد میں مولانا سندھی ان سے جا ملے اور دونوں نے مل کر کام کیا۔ اس ہیڈ کوارٹر کی شاخیں مدینہ منورہؒ، برلن، استنبول، انقرہؒ اور قسطنطنیہؒ میں تھیں۔ برلن میں لالہ ہردیال نے نمایاں کام کیا۔ ان کی کوشش سے جرمنی اور ترکی کا پیکٹ ہوا اور جرمنی ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ کابل کے ہیڈ کوارٹر نے فقید المثال کارنامہ انجام دیا۔ امیر حبیب اللہ اور اس کے لڑکے عنایت اللہ خان کے

دو مخلصین (جو بعد میں غداری پر منتج ہوا) کے باوجود تحریک کے آدمیوں کو افغانستان کی سیاست میں اتنا دخل عمل حاصل ہو گیا کہ تحریک کی ناکامی کے بعد قائدین کے دوست اور ہمدرد افسروں نے امیر حبیب اللہ خاں کو قتل کروا کر اس کے بیٹے امان اللہ کو تخت پر بٹھایا جنہوں نے شروع سے تحریک کی اخلاقی اور مالی مدد کی تھی۔ انہوں نے تخت پر بیٹھتے ہی تحریک کے نظر بند قائدین کو رہا کر کے اپنے مشیر بنا لئے۔ قائدین تحریک ہی کے مشورے سے امان اللہ خاں نے انگریزوں سے دو ہاتھ کئے اور ۲۳ر اگست ۱۹۱۹ء کو افغانستان کو مکمل آزاد کرا لیا۔ مولانا سندھیؒ افغانستان میں چوری چھپے داخل ہوئے تھے تو فوج کے سپہ سالار نادر خان نے قندھار میں ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ جب قائدین تحریک کے ایما پر انگریزوں سے لڑنے کے بارے میں رائے معلوم کرنے کے لئے جرگہ بلایا گیا تو حبیب اللہ خاں اور عنایت اللہ خاں کے سوا سب لوگوں نے لڑائی کے حق میں رائے دی۔ ان میں امان اللہ خاں اور ان کا بھائی نصر اللہ خاں پیش پیش تھے۔

آٹھواں منصوبہ یہ تھا کہ برطانیہ اور ترکی کی آویزش میں (وسیع تر مقصد یہ تھا کہ ترکی کے ہندوستان پر حملے کے لئے) بعض ملکوں مثلاً روس، جرمنی، فرانس اور امریکہ کو ترکی کی حمایت پر آمادہ کیا جائے۔ اس ضمن میں کراچی میں اکابرین تحریک کی ایک مجلس مشاورت ہوئی۔ مولانا محمد علی کا خیال تھا کہ امریکہ ترکی کا ساتھ دے گا کیونکہ وہ خود بھی برطانیہ کا غلام رہ چکا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا خیال تھا کہ امریکہ غیر جانبدار رہے گا لیکن شیخ الہندؒ کا موقف تھا کہ امریکہ برطانیہ کی کھلے بندوں مدد کرے گا۔ چنانچہ یہی ہوا بھی۔ تاہم امریکہ اور فرانس کے انصاف پسند لوگوں نے برطانیہ کے خلاف احتجاج کیا اور تحریک کا مشن کسی حد تک کامیاب رہا۔

روس میں بھی تحریک کا مشن حکومت کی سطح پر ناکام رہا۔ زار نے مشن کے قائدین ڈاکٹر مرزا احمد علی اور متھرا سنگھ کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن تاشقند کے گورنر نے جو تحریک کا ہمدرد بن گیا تھا، انہیں گرفتاری سے بچا لیا۔ اس مشن کا تذکرہ روس کے انقلابیوں نے اپنے ایک پمفلٹ میں بھی کیا تھا اور اسے مؤثر قرار دیا تھا۔ عوامی سطح پر مشن اپنے مقصد میں کامیاب رہا اور روس برطانیہ دوستی خطرے میں پڑ گئی جس کے نتیجے میں زار کا تخت خود روس کو ہی بہا لے گیا۔ البتہ ایک دوسرا مشن جو روس کے راستے جاپان جا رہا تھا، زار کے ہتھے چڑھ گیا۔ بدقسمتی سے متھرا سنگھ جو اس مشن میں بھی شامل تھے، اپنے ساتھی عبدالقادر سمیت انگریزوں کے حوالے کر دئے گئے۔ انگریزوں نے متھرا سنگھ کو پھانسی دے دی اور عبدالقادر کو لمبی قید کی سزا دی۔

بیرون ملک تحریک کو صرف جرمنی میں کامیابی حاصل ہوئی راجہ مہندر پرتاپ نے وہاں تین سال

رہ کر یہ کارنامہ انجام دیا۔ پروفیسر برکت اللہ اور لالہ ہردیال نے بھی ان کی اعانت کی۔ اس سلسلے میں جرمنی کے کیپٹن ہنٹس نے بڑی مدد کی۔ وہ محاذ کے معائنے کے لئے کابل بھی گیا۔ یہ کوششیں بار آور ہوئیں اور جرمنی ترکی کی مدد کرنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ مطمئن ہو کر راجہ مہندر پرتاپ کابل چلے گئے جہاں مولانا سندھی بھی پہنچ گئے۔

نویں منصوبے میں حملے کے لئے راستوں کا تعین کرنا تھا۔ ایران برطانیہ کا حلیف اور ترکی کا دشمن تھا، اس لئے وہ راستہ ترک کرنا پڑا۔ دوسرا راستہ افغانستان کے ذریعہ تھا۔ امان اللہ خاں اور سول اور فوجی افسروں اور قبائلی سرداروں کے اٹل فیصلے سے ڈر کر حبیب اللہ خاں راستہ دینے پر آمادہ ہو گیا لیکن انگریز دوستی کا حق ادا کرنے کے لئے تجویز پیش کی کہ ترکی فوج بعض مخصوص دروں سے گزرے۔ ہم انگریزوں سے کہہ دیں گے کہ وہاں کے قبائلی باغی ہو گئے ہیں اور ہم مجبور ہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری فوج جنگ میں حصہ نہ لے، البتہ رعایا رضاکارانہ طور پر حصہ لے سکتی ہے۔ دراصل اس کا مقصد یہ تھا کہ فریقین میں جس کا پلہ بھاری دیکھوں گا اس کے ساتھ ہو جاؤں گا۔

امان اللہ خاں اور نصر اللہ خان نے قائدین تحریک کو سمجھایا کہ اسی پر اکتفا کریں۔ جب ترکی کی فوج ملک میں داخل ہو جائے گی۔ تو ہم اپنے باپ کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر لیں گے ورنہ اُسے راستے سے ہٹا دیں گے۔ حملے کے لئے چار محاذ بنائے گئے۔ ہر محاذ پر ایک انقلابی کو نگران مقرر کیا گیا۔ ۱۔ مولانا محمد صادق کی نگرانی میں قلات اور مکران کے قبائل کا ترک، فوج کی قیادت میں کراچی پر حملہ۔ ۲۔ حافظ تاج محمود سندھی کی نگرانی میں ترک فوج کی سربراہی میں غزنی اور قندھار کے قبائل کا کوئٹہ ۳۔ درہ خیبر کے راستے پشاور پر مہمند اور مسعود قبائل کا ترک، فوج کی قیادت میں حملہ۔ نگران حاجی ترنگ زئی تھے۔ ۴۔ اوگی کے محاذ پر ترکی کی فوج کا کوہستانی قبائل کو لے کر حملہ، نگرانی مولانا محمد اسحاق کی تھی۔

دسویں منصوبے کا مقصد حملے اور بغاوت کی ایک تاریخ مقرر کرنا تھا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۴ء تک نو منصوبوں کو کامیابی سے عملی جامہ پہنایا گیا اور دسویں پر عمل باقی تھا کہ جنگ عظیم چھڑ گئی۔ یہ انقلابیوں کے لئے سنہری موقع تھا۔ فوراً دیوبند میں مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ بیرونی حملہ اور اندرونی بغاوت ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء کو ہو۔ مجلس شوریٰ نے اس کی اطلاع تمام شاخوں کو دے دی اور کہا کہ بغاوت کے لئے تیار رہیں لیکن حملے کی تاریخ کے حتمی فیصلے کے لئے دوسری اطلاع کا انتظار کریں۔ شیخ الہندؒ کو ایک وثیقہ لکھ کر دیا گیا جس پر مجلس شوریٰ کے سارے اراکین نے دستخط کئے۔ طے کیا گیا کہ شیخ الہندؒ غازی انور پاشا سے بالمشافہ مل کر مجوزہ تاریخ کی منظوری لیں اور تحریک اور حکومت کے مابین

نیز حکومتِ ترکی اور حکومتِ افغانستان کے درمیان تحریری معاہدہ کرائیں۔ اس دوسرے معاہدے کے سلسلے میں انہیں انور پاشا کی تحریر دے کر افغانستان جانا تھا۔ اور اس پر حبیب اللہ خاں سے دستخط لے کر واپس انور پاشا کو پہنچانا تھا۔

شیخ الہندؒ نے اپنی جائداد شرعی قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم کر دی اور حج کا ارادہ ظاہر کر کے روانہ ہو گئے۔ حکومت نے انہیں دہلی میں گرفتار کرنے کا ارادہ کیا ——————————

—————— لیکن ان کے معتقدین کا ہجوم دیکھ کر بمبئی میں گرفتار کرنے کی ٹھانی۔ ڈاکٹر انصاری نے خفیہ پولیس میں اپنے آدمیوں کی مدد سے اس تار کو ہوم سیکرٹری کے دفتر میں رکوا دیا جو اس مقصد سے گورنر جنرل کی طرف سے بمبئی کے گورنر کو بھیجا جا رہا تھا۔ یہ تار اس وقت ملا جب آپ جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔

چنانچہ عدن کے گورنر کو روانہ کر دیا گیا۔ لیکن وہاں بھی انقلابیوں نے بروقت پہنچنے نہ دیا۔ اور آپ بخیر و عافیت مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ اس وقت حجاز ترکی کے زیرِ حکومت تھا۔ وہاں کے گورنر غالب پاشا جو انور پاشا کی جنگی کمیٹی کے سیکرٹری بھی تھے، انقلابی تحریک کے ہمنوا تھے۔ شیخ الہندؒ نے ان سے دو تحریریں لیں ایک میں جہاد کی ترغیب تھی۔ اسے چھپوا کر ہندوستان اور افغانستان میں تقسیم کرانا تھا۔ دوسری تحریر حکومت افغانستان کے نام تھی کہ شیخ الہندؒ جو کچھ بھی کہیں گے اسے ہماری تائید حاصل ہے۔ انگریزوں نے اس پہلی تحریر کو غالب نامہ کہا اور اسی کی بنا پر بعد میں غالب پاشا کو گرفتار کر کے جنگی قیدی رکھا۔ انہوں نے بھی اپنی اسی تحریر کا اقرار کیا۔ دوسری کا نام تک نہ لیا۔

شیخ الہندؒ نے غالب نامہ مولانا محمد میاں کے حوالے کیا کہ اسے ہندوستان اور افغانستان لے جائیں۔ وہ ہندوستان پہنچے تو سی آئی ڈی پیچھے لگ گئی۔ چنانچہ افغانستان چلے گئے اور اس کی اشاعت کی۔ اسی اثنا میں "ریشمی رومال" پکڑا گیا اور "غالب نامہ" بیکار ہو کر رہ گیا۔ غالب پاشا کی دوسری تحریر بھی رائیگاں گئی، وہ ریشمی رومال کے پکڑے جانے کے بعد افغانستان پہنچی، البتہ اس سے افسروں اور قبائلی سرداروں میں نیا عزم پیدا ہوا اور امان اللہ خاں انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے۔

شیخ الہندؒ اور انور پاشا کی ملاقات مدینہ منورہ میں ہوئی۔ جمال پاشا ان کے ساتھ تھے۔ انور پاشا نے پہلے ان سے تحریر کردہ دونوں معاہدے لے لئے اور واپس چلے گئے۔ ایک ماہ بعد یہ معاہدے شیخ الہندؒ کو مدینہ منورہ کے گورنر نے بلا کر دئے۔ ان پر انور پاشا کے دستخط ثبت تھے اور حملے اور بغاوت کی منظوری بھی تھی۔ دونوں معاہدوں کا مجموعی نام انور نامہ رکھا گیا۔ شیخ الہندؒ نے تحریک اور حکومت ترکی کے معاہدے کو اپنے پاس رکھ لیا اور افغانستان ترکی معاہدہ مولانا ہادی حسن کو دے کر انہیں بھیج دیا

کہ اسے افغانستان پہنچا دیا جائے۔

اس دستاویز کو بھجوانے میں شیخ الہندؒ نے غیر معمولی حسن تدبیر سے کام لیا۔ خاص طور سے لکڑی کا ایک صندوق بنوایا۔ اس کے تختوں کے درمیان اُسے اس طرح چھپایا کہ نظر نہ آتا تھا۔ ساتھ ہی بمبئی کے ایک رکن کو پیغام بھجوایا کہ وہ عرشہ جہاز پر ہی مولانا ہادی حسن سے صندوق لے لیں اور اُسے فلاں پتے پر پارسل کر دیں۔ جوں ہی جہاز بمبئی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا، وہ رکن عرشۂ جہاز پر گئے اور اسے قلیوں سے اٹھوا کر باہر لے گئے۔ اسی وقت اُسے مظفر نگر میں حاجی محمد نبی کے پتے پر پارسل کروا دیا۔ سی آئی ڈی نے مولانا ہادی حسن کی تلاشی لی اور انہیں مشتبہ قرار دے کر نینی تال بھجوا دیا جہاں انہیں حوالات میں بند کر دیا گیا۔

حاجی محمد نبی کو شیخ الہندؒ نے ساری بات کہلوا بھیجی تھی۔ انہوں نے معاہدے کو اپنے پاس رکھا۔ کچھ عرصے بعد مولانا ہادی حسن رہا ہو کر آئے۔ انہوں نے حلیہ بدل کر اپنا نام ظفر احمد رکھا اور معاہدے کو افغانستان پہنچا دیا۔ حبیب اللہ خاں نے اپنے دونوں بیٹوں امان اللہ خاں اور نصر اللہ خاں اور سول فوجی افسروں اور قبائلی سرداروں کو آتش زیر پا دیکھا تو طوعاً و کرہاً اس کی منظوری دے دی۔

مولانا عبید اللہ سندھی اور نصر اللہ خاں نے ایک ماہر کاریگر سے معاہدے کی ساری عبارت جو عربی زبان میں تھی ایک ریشمی رومال پر کڑھوالی۔ اس میں حبیب اللہ خاں اور اس کے تینوں بیٹوں کے دستخط بھی آ گئے۔ رومال کا رنگ زرد تھا اس کی لمبائی چوڑائی ایک مربع گز تھی اس پر زرد رنگ سے چاروں کے دستخط دوبارہ کروائے گئے۔ اس کے بعد رومال پشاور بھجوایا گیا۔ یہ فرض شیخ عبدالحق نے انجام دیا جو بنارس کے نومسلم گریجویٹ تھے۔ اور افغانستان، ہندوستان کے درمیان کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ اسی تجارت کی آڑ میں پیغام رسانی کرتے تھے۔ انہوں نے اسی قسم کے پانچ رومال لئے اور ریشمی رومال کو ان میں ملا دیا۔ پروگرام یہ تھا کہ رومال حیدر آباد میں شیخ عبدالرحیم کو پہنچایا جائے گا جو اسے لے کر حج کو جائیں گے اور شیخ الہندؒ کے حوالے کریں گے۔ موصوف اسے انور پاشا کو جا کر دیں گے، اور پروگرام کے مطابق ترکی، افغانستان کے راستے ۱۹ فروری ۱۹۱۷ء کو ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔

شیخ عبدالحق نے یہ امانت پشاور میں حق نواز خاں کو رات نو بجے پہنچائی۔ انہوں نے اسے صبح چار بجے ایک خاص آدمی کے ہاتھ بہاول پور کے مقام دین پور میں سجادہ نشین خواجہ غلام محمد کو بھجوا دیا۔ نماز صبح سے پہلے فوج نے حق نواز خاں کے گھر پر چھاپہ مارا اور انہیں گرفتار کر لیا۔ ان کی رہائی ایک ماہ بعد ہوئی۔ خواجہ غلام محمد کو رومال اگلے دن صبح دس بجے ملا۔ انہوں نے اسی وقت اسے ایک آدمی کے

بالفعل حیدر آباد چلتا گیا۔ ان کے گھر پر بھی فوج نے شام کے چار بجے چھاپہ مارا اور انہیں گرفتار کر لیا۔ چار ماہ تک قید رہے۔

ریشمی رومال دوسرے دن دوپہر کو حیدر آباد میں شیخ عبدالرحیم کو ملا۔ اور عشاء کے وقت جب وہ اسے گدڑی میں سی رہے تھے، فوج کے ہتھے چڑھ گیا۔

اس دستاویز کے ہاتھ آجانے سے انگریزوں کو مجاہدین اور حکومت ترکی کے تفصیلی عزائم کا ثبوت مل گیا۔ انہوں نے داخلی طور پر یہ فوری قدم اٹھایا کہ ہر اس مقام پر فوج بھیج دی جہاں بغاوت کا خطرہ تھا۔ اور شمال مغربی سرحد پر فوج دوگنی کر دی۔ اس کے ساتھ ہی ملک بھر میں انقلابیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی جس شخص پر بھی ذرا سا شبہ گزرا، اسے گرفتار کر لیا۔ گرفتار شدگان پر طرح طرح کی سختیاں کیں۔ دو چار کے سوا سب ہی ثابت قدم رہے۔ تاہم تحریک دفن ہو گئی۔

خارجی طور پر سب سے پہلے ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور ترکی کی ہر سرحد پر محاذ کھول دیئے۔ ایران میں فوج داخل کر کے ترکی اور افغانستان کے درمیان حد بندی کر دی۔ سب سے بڑا انتقام یہ لیا کہ شریف مکہ کو آلۂ کار بنا کر اس سے ترکی کے خلاف بغاوت کرا دی۔ عرب قومیت کا پُر فریب اور تباہ کن نعرہ یہیں سے بلند ہوا اس کے علاوہ عرب اور ہندوستان کے زر خرید مولویوں سے ترکوں کے خلاف فتوے دلوائے۔

جنگ ختم ہو چکی تھی اور انگریزوں کو موقع مل گیا تھا کہ افغانستان کو دبائیں لیکن تحریک کے جو کارکن وہاں گرفتاری سے بچ رہے تھے، انہوں نے قبائلیوں کی بڑی راہنمائی کی۔ حاجی ترنگ زئی نے قبائلیوں کو جمع کر کے تین سال تک انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ [illegible] قبائل نے دو سال تک مقابلہ کیا۔ امان اللہ خان نے کوہاٹ تک قبضہ کر لیا تھا لیکن انگریزوں سے صلح ہو گئی اور افغانستان کی مکمل آزادی اور خود مختاری تسلیم کر لی گئی۔

شیخ الہندؒ کو مکہ معظمہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر مصر کی فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا، اور پھر جنگی قیدی بنا کر مالٹا بھیج دیا گیا۔ جنگ ختم ہوئی تو ہندوستان آئے۔ کچھ عرصے خلافت تحریک میں کام کیا اور رحلت فرمائی ــــــ ••

اگر ویت نام یا دنیا کے کسی دوسرے خطّے میں فوجی مداخلت سے امریکہ کا مقصد قبضہ کرکے وہاں کی دولت سے فائدہ اٹھانا ہے تو پھر امریکہ کی یہ خواہش کیوں ہے کہ جنگ کو بڑھایا جائے اور اسے طول دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے بات وہی ہے۔ جو "جان بوش" نے کہی ہے کہ امریکہ کا مقصد قبضہ کرنا اور وہاں (ویٹ نام) کے ذرائع آمدنی سے فائدہ اٹھانا نہیں بلکہ اپنے ملک کی فوجی صنعت کے کاروبار کو جاری رکھنا ہے۔ امریکہ ویت نام ہی میں نہیں، دنیا کے باقی حصّوں میں بھی فوجی مداخلت کر رہا ہے۔ ویت نام کی موجودہ جنگ سے پہلے فرانس کی مدد کرتا رہا ہے۔ عربوں کے خلاف اسرائیل کی مدد کر رہا ہے۔ پاکستان کے خلاف بھارت کو اسلحہ دے رہا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ امریکہ کا اصل مقصد نئی فتوحات حاصل کرنا نہیں بلکہ اپنے ملک کے اسلحہ کی مارکیٹ پیدا کرنا اور تیار اسلحہ کو ضائع کرکے نیا اسلحہ تیار کرنا ہے تاکہ سرمایہ داروں، صنعت کاروں اور فوجی جرنیلوں کے متحدہ مقاصد پورے ہوتے رہیں۔

جان بوش لکھتا ہے:

"ریاستہائے متحدہ امریکہ ویت نام کی جنگ میں ایک مہینہ میں جس قدر دولت خرچ کر رہا ہے۔ اس قدر دولت پورے ہند چینی کے وسائل آمدن سے پانچ سالوں میں بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ویت نام میں سال بھر کے جنگی اخراجات اس قدر زیادہ ہیں کہ استعماری طریقوں سے کام لے کر یہ اخراجات پچاس سالوں میں بھی پورے نہیں ہو سکتے۔"

برٹن آگے چل کر رقمطراز ہے :

"ریاستہائے متحدہ امریکہ کے سرمایہ داروں کا مقصد ویت نام کی جنگ سے اس علاقے کو فتح کرنا نہیں بلکہ فوجی صنعت کو جاری رکھنا ہے۔ طیارہ سازی جہاز سازی۔ اسلحہ کے کارخانے اور سپاہیوں کی ضروریات کی بیشمار چیزوں کی تیاری کی صنعت میں لگایا ہوا سرمایہ اسی صورت میں نفع بخش ہو سکتا ہے کہ جنگ جاری رہے۔"

پھر لکھتا ہے :

"امریکہ کے سرمایہ داروں کو اس سے غرض نہیں کہ ان کا تیار کیا ہوا اسلحہ سمندر میں غرق کیا جا رہا ہے یا لڑائی میں استعمال ہو رہا ہے۔ انہیں بس اپنے منافع سے غرض ہے۔"

جان بوش کے یہ بیانات رسل کے اس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ ویت نام میں فوجی مداخلت سے امریکہ کا اصل مقصد اس ملک کو فتح کر کے یہاں کی دولت سے فائدہ اٹھانا ہے۔ بوش کے دلائل وزنی ہیں وہ کہتا ہے ویت نام چھوڑ پورے ہند چینی سے جس قدر نفع اندوزی متوقع ہو سکتی ہے اس سے زیادہ فوجی کارروائیوں پر خرچ ہو رہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ سرمایہ دارانہ ذہن اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ کم نفع کی توقع پہ زیادہ نقد خرچ کیا جائے، اور یہ حقیقت بھی جان بوش کے خیال کی تائید کرتی ہے کہ امریکہ ایسے ممالک میں بھی اسلحہ خرچ کر رہا ہے جہاں سے نفع کی سرے سے توقع ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جدید استعمار کے شرکار بھی امریکی سرمایہ دار، صنعت کار، بڑے بڑے تاجر، ٹھیکیدار اور فوجی جرنیل مل کر امریکی عوام کے قومی خزانے سے رقم حاصل کرتے ہیں۔ اور بہانہ یہ کرتے ہیں کہ ویت نام وغیرہ ممالک میں امن اور امریکی مفادات کی حفاظت کیلئے امریکی افواج لڑ رہی ہیں۔ اور ان کے لئے اسلحہ اور دوسرے مصارف کا پورا کرنا نہایت ضروری ہے۔ امریکی عوام مفاد پرستوں کے اس گروہ کے فریب میں آکر انہیں قومی خزانے سے سب کچھ لوٹ لے جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ دراصل امریکہ کے قومی خزانے کے محافظ بھی وہی لوگ ہیں جو جدید استعمار کے زرخرید ہیں۔

امریکی صدر اور دوسرے ذمہ داران کے جو بیانات رسل نے نقل کئے ہیں اور جن میں

کیا گیا ہے۔ کہ امریکہ ویت نام کو فتح کر کے یہاں کی دولت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ یہ وہ بیانات ہیں جو عوام کو دھوکہ دینے کے لئے دئیے گئے ہیں۔ انہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ ہمارے اخراجات اور متوقع نفع میں کیا نسبت ہے۔؟

جان بوش نے ایک مثال کے ذریعہ بتایا ہے کہ امریکی استعمار کس طرح اپنے ملک کے عوام کو لوٹتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فوجی جرنیل ہوائی جہازوں کی تیاری کا ٹھیکہ دیتے ہیں۔ یہ ٹھیکہ وہ لوگ لیتے ہیں جو فوجی جرنیلوں کے شریک کار ہوتے ہیں۔ بنک کے مالکان فوری طور پر روپیہ دیدیتے ہیں اور اس طرح چند ہی روز میں جہازوں کی تیاری کا کاروبار شروع ہو جاتا ہے۔ فوجی جرنیل یہ جہاز ویت نام یا کسی دوسرے جنگی محاذ پہ لے جا کر تباہ کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح نئے جہازوں کی تیاری کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بوش کہتا ہے کہ جہازوں کا مطالبہ کرنے والے ٹھیکہ لینے والے روپیہ فراہم کرنے والے اور جہازوں کو تباہ کرنے والے سب کے سب ایک ہی گروہ کے افراد ہوتے ہیں۔ یہ گروہ جدید استعمار کا ہے۔ البتہ اس شیطانی چکر کے لئے رقم فراہم کرنے والے غریب عوام ہوتے ہیں جو ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

جان بوش نے لکھا ہے:

"ویت نام میں جنگ کے آغاز سے ۱۹۶۶ء تک کے مختصر سے عرصے میں امریکہ کے کروڑ پتیوں میں ۱۲۴ کا اضافہ ہو چکا ہے۔"

غور فرمائیں ایک طرف ملک (امریکہ) جنگی اخراجات کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہے اور دوسری طرف کروڑ پتیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جب جنگی اخراجات کا بوجھ عوام اٹھاتے اور سرمایہ دار نفع کماتے ہیں۔

بقول جان بوش:

"۱۹۶۷ء میں امریکہ کے صدر جانسن نے کہا تھا کہ ویت نام کی جنگ نے کاروباری لوگوں کو یقین دلا دیا ہے۔ کہ مستقبل قریب میں انکا کاروبار مندے کا شکار نہیں ہوگا۔"

سوچنے کی بات یہ ہے کہ صدر جانسن نے جن کاروباری لوگوں کے تحفظ کا یقین دلایا ہے یہ کون لوگ ہیں۔؟ اور ان کا کاروبار کیا ہے۔؟ اس کا جواب جان بوش کے الفاظ میں یہ ہے:

"یہ کاروباری لوگ پنٹاگون (فوجی مرکز) کی اقتصادی حالت کے مالک و

مختار ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فوجی مقاصد کے لئے ٹھیکے لیتے ہیں۔ یہ صنعت کار، ہنرکار، جہازران اداروں کے مالک، بڑے تاجر۔ اور امریکہ کی خارجہ حکمت عملی کے بنانے اور چلانے والے ہیں۔"

غرض جدید استعمار ان کاروباری لوگوں کا گروہ ہے، جو فوجی کارروائیوں کے نتیجے میں نفع کماتے ہیں اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کا صدر ان کا اپنا آدمی ہے اور وہ ملک کی خارجہ حکمت عملی اسی اصول پر مرتب کرتا ہے، جس سے جدید استعمار کے کاروبار میں ترقی ہوتی ہے۔

جنگی مصارف | غور فرمائیے کہ جدید استعمار جنگ پر کس قدر دولت صرف کر رہا ہے؟
بوش لکھتا ہے:

"انیسویں صدی میں استعمار نے افریقہ اور ایشیا کے بڑے اعظموں میں بے مثال فتوحات حاصل کرنے کے لئے جس قدر دولت خرچ کی تھی اس سے بی ۲۰۵ قسم کے طیاروں کا ایک دستہ بھی تیار نہیں ہو سکتا۔"

آگے چل کر لکھتا ہے:

"اگر ٹرانسوال کی ہیرے کی کانیں ویت نام میں ہوں اور امریکہ ان سے پچاس سال تک ہیرے نکالتا رہے تو بھی اسے اتنی دولت حاصل نہیں ہو سکتی جتنی دولت امریکہ نے ایک سال (۱۹۶۷ء) میں ویت نام کی جنگ پر خرچ کی ہے۔"

لارڈ رسل نے امریکہ کے جنگی مصارف کا نقشہ یوں پیش کیا ہے، کہتا ہے:

"اس سلطنت (امریکہ) کی جارحیت بنی نوع انسان پہ ایک لاکھ چالیس ہزار ملین ڈالر سالانہ اور سولہ ملین ڈالر (یعنی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر) فی گھنٹہ کا خرچ عائد کر رہی ہے۔ ہتھیاروں پر موجودہ خرچ تمام ترقی پذیر ملکوں کی قومی آمدنی سے زیادہ ہے۔ یہ ساری دنیا کی سالانہ برآمدات سے زیادہ ہے۔ یہ افریقہ ایشیا اور لاطینی امریکہ کی قومی آمدن سے زیادہ ہے۔ امریکہ کا فوجی بجٹ تقریباً ساٹھ ہزار ملین ڈالر سالانہ ہے۔ ایک اٹلس میزائل پر ۳ کروڑ ڈالر خرچ آتا ہے۔ اس خرچ سے سالانہ ستر ہزار ٹن کھاد تیار کرنے والا کارخانہ بنایا جا سکتا ہے۔"

یاد رہے کہ امریکی سرمایہ دار نفع اندوزی کی ہوس میں صرف فوجی نوعیت ہی کا سامان برباد نہیں کرتے بلکہ اشیائے خوردنی اور روزمرہ کی زندگی میں کام آنے والی دوسری چیزیں بھی برباد کرتے

میں - چنانچہ رسل لکھتا ہے:

"پچھلے چودہ برس میں امریکہ نے فالتو زرعی پیداوار خرید نے پر چار ارب ڈالر خرچ کئے ہیں۔ لاکھوں ٹن گندم، باجرہ، مکئی، مکھن اور پنیر ذخیرہ کر کے ان میں زہر ملا دیا گیا تاکہ دنیا کے بازاروں میں قیمتیں زیادہ رکھی جا سکیں۔ مکھن اور پنیر کے بڑے بڑے پہاڑوں میں نیلا تھوتھا ملا دیا جاتا ہے تاکہ وہ ناقابل استعمال ہو جائے ۱۹۶۰ء تک ساڑھے بارہ کروڑ ٹن غلہ امریکہ میں ذخیرہ کیا گیا تاکہ سڑ جائے۔ یہ غلہ ہندوستان کی پوری آبادی کے لئے ایک سال کے لئے کافی ہو سکتا تھا"

اس طرح خوراک اور ضروریات زندگی کی چیزیں کیوں برباد کی جاتی ہیں۔؟ اس کا جواب رسل کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"اشیائے خوردنی کی ناقابل تصور حد تک وسیع مقدار امریکی سرمایہ دار سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تباہ کر دیتے ہیں اور سوائے اس کے کوئی مقصد نہیں ہوتا کہ ان کا نفع جاری رہے اور ان کا اقتدار برقرار رہے۔ مٹھی بھر لوگ گدھوں کی طرح غریبوں اور مظلوموں کا خون چوس چوس کر فربہ ہوتے رہتے ہیں ـــــ"

غرض امریکی سرمایہ دار (جدید استعمار) اپنے ذاتی نفع اور لالچ کی خاطر امریکی عوام کی محنت سے کمائی ہوئی دولت ضائع کرتے ہیں۔ فوجی نوعیت کا سامان ویت نام اور دوسرے جنگی محاذوں پر برباد کرتے ہیں اور اشیائے خوردنی اور روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہونے والی دوسری چیزیں مختلف طریقوں سے ضائع کرتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں ضائع نہ ہوں تو ان کے کاروبار بند ہو جاتے ہیں ـــــ

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس روشنی زمانے میں جبکہ دنیا کے گوشے گوشے کی خبریں آن واحد میں ہر جگہ پہنچ جاتی ہیں۔ امریکی عوام اس قدر بے خبر کیوں ہیں کہ انہیں چند سرمایہ دار فوجی جرنیلوں اور صنعت کاروں سے لوٹ رہے ہیں۔ اور انہیں احساس تک نہیں ہوتا۔ اس سوال کا جواب جان بوش نے "امریکی پروپیگنڈا" کے عنوان سے دیا ہے۔ بوش کہتا ہے کہ جدید استعمار کا پروپیگنڈا اس حد تک شدید اور سخت ہے کہ کوئی شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ـــــ۔

یہ سخت غلط فہمی ہے کہ نبوت کو ان کمالات میں سے سمجھ لیا جائے جو پہلی امتوں کو کسی عبادت و ریاضت کے صلہ میں یا انعام کے طور پر تقسیم کئے گئے ہیں۔ یہ صرف تشریعی ضرورتوں کی تکمیل کا ایک منصب ہے جس میں قدرت اس کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اس کو اس منصب کے لئے منتخب کر لیتی ہے۔

اگر نبوت ان کمالات میں سے ہوتی جو مجاہدات و ریاضات، پاکبازی، حسن نیت، وغیرہ عبادات کے صلہ میں انعامی طور پر ملتے ہیں تو یقیناً اس کے لئے سب سے موافق زمانہ خود نبی کی موجودگی کا زمانہ ہوتا، کیونکہ جتنی عملی جدوجہد، اتباع شریعت کا جتنا جذبہ خود نبی کے زمانہ میں ہوتا ہے اس کے بعد نہیں ہوتا۔ مگر نبوت کی تاریخ اس کے برخلاف ہے۔ یعنی جب خدا تعالیٰ کی زمین شر و فساد، طغیانی و سرکشی، تکبر و غرور سے بھر گئی ہے، صلاح و تقویٰ کا تخم فاسد ہو گیا ہے، رشد و ہدایت کے آثار محو ہو گئے ہیں، وہی وقت انبیاء علیہم السلام کی آمد کا سب سے زیادہ موزوں قرار پایا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان نہیں ہے کہ نبوت وہ انعام نہیں ہے کہ ولایت و صدیقیت کی طرح امتوں میں تقسیم کی جائے۔ بلکہ دنیا کے انتہائی دور ضلالت میں خدا کی صفت ہدایت کا اقتضاء ہے۔ اس میں کسب و اکتساب اور ماحول کی مساعدت و نامساعدت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ حاصل یہ ہے کہ نبوت ان کمالات میں سے نہیں ہے جو ریاضات و مجاہدات کے صلہ میں بطور انعام کسی وقت بھی بخش دیا گیا ہو بلکہ یہ ایک الٰہی منصب ہے جس کا تعلق تشریعی ضرورت اور براہ راست خدا تعالیٰ کی صفت اجتباء و اصطفاء کے ساتھ ہے وہ جسے چاہتا ہے اس منصب کے لئے چن لیتا ہے۔

رسالت کا مفہوم | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا صحیح اور پورا مفہوم اسی وقت ادا ہوتا ہے جبکہ آپ کو خاتم النبیین بھی سمجھا جائے۔ آپ کو صرف رسول اللہ سمجھنا اور خاتم النبیین نہ سمجھنا آپ کی حیثیت کے صرف ایک ہی جزء کو ادا کرتا ہے۔ اور وہ بھی مشترک جزء کو۔ آپ کے منصب عالی کا ممتاز جزء خاتم النبیین ہے۔ لیکن چونکہ یہ دونوں حیثیتیں آپ کی ذات میں جمع ہیں اور اس طرح جمع ہیں گویا ایک ذات کے دو عنوان ہیں۔ اس لئے عام طور پر صرف اقرار رسالت ختم نبوت کے اقرار کیلئے کافی سمجھا گیا جیساکہ کلمۂ توحید کا اقرار، اس کا اقرار گو رسالت کے اقرار سے ایک جداگانہ شئے ہے مگر جو توحید آپ کی حکم برداری میں تسلیم کی جائے وہ اقرار بالرسالۃ کے ہم معنی ہے اس لئے بعض احادیث میں صرف کلمہ توحید کی شہادت کو مدارِ نجات قرار دیدیا گیا ہے۔ اسی طرح آپ کی رسالت اور ختم نبوت کا مسئلہ سمجھنا چاہیئے۔

عقیدۂ ختم نبوت ایمان کا جزء ہے | حدیث میں جسطرح خدا تعالیٰ کی توحید پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ختم نبوت پر بھی ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان آپ کی ختم نبوت پر ایمان لائے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں ولکن رسول اللہ کے ساتھ وخاتم النبیین کا لفظ اسی لئے ہے کہ آپ صرف رسول اللہ نہیں ہیں بلکہ خاتم النبیین بھی ہیں۔ اس کے برخلاف آپ سے پیشتر جتنے رسول ہوئے وہ صرف رسول اللہ تھے اسی لئے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خاتم النبیین ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص لقب ہے۔ اور آپ نے ہی اس کا دعوی کیا ہے۔ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا یہ لقب صرف بطور مدح نہیں ہے بلکہ یہ بہ حیثیت عقیدہ کے ایک عقیدہ ہے۔ خاتم الشعراء اور خاتم المحدثین کی طرح یہ صرف ایک محاورہ نہیں ہے۔

رسول اللہ کا تصوّر | آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تصوّر کیلئے دو باتوں کا تصوّر ضروری ہے۔ یہ کہ آپ رسول اللہ ہیں، اور یہ کہ آپ خاتم النبیین بھی ہیں۔ آپ کے متعلق صرف رسول اللہ کا تصوّر آپ کی ذات گرامی کا ادھورا اور ناتمام تصوّر ہے بلکہ ان ہر دو تصورات پر آپ کا امتیازی تصوّر خاتم النبیین ہی ہے۔

ضروری تنبیہ | جب کسی لفظ کا ایک مفہوم اور اسکی مراد امت مسلمہ کے تواتر استعمال کرنے اور اجماع سے متعین ہو گئی ہو۔ تو قرآن وحدیث میں اس لفظ کے وہی معنی مراد لئے جائیں گے

اور کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ لغت کی استعانت یا دیگر شواہد سے اس لفظ کے دوسرے معنی اور مفہوم مراد لے مثلاً وحی کا لفظ ہے۔ لغت میں وہ کس معنی کے لئے ہے اب اس پر بحث کرنی غیر ضروری ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں جب اس لفظ کا استعمال انبیاء علیہم السلام کے دائرہ میں ہوا ہے تو اس کے معنی بندہ اور حق تعالیٰ کے مابین ہمکلامی کے ہوتے ہیں۔ اس لئے جب کہیں وحی کا لفظ انبیاء و رسل کے بارہ میں استعمال کیا جائے گا تو اس کے یہی مراد لئے جائیں گے یا مثلاً نبی کا لفظ ہے۔ یہ نباء سے مشتق ہے اور لغت میں انباء گو ہر خبر کیلئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا عام استعمال اب صرف غیب کی خبروں میں ہوتا ہے۔ تو نبی اللہ کے معنی (فعیل بمعنی مفعول کا لحاظ کرتے ہوئے) یہ ہوں گے الذی نباہ اللہ "یعنی جسکو اللہ نے نبی بنایا ہو اور اس کو غیب کی خبریں دی ہوں" اس کے بعد اب ختم نبوت کے مفہوم اور معنی پر غور کیجئے۔

ختم نبوت کے معنی | ختم نبوت کا لفظ ہمیشہ سے امت مسلمہ میں تواتر کے ساتھ استعمال ہوتا چلا آیا ہے۔ اور ہمیشہ سے اس لفظ کا مفہوم صرف یہی سمجھا گیا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی جدید نبوت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ خواہ وہ کسی قسم اور کسی مرتبہ ہی کی کیوں نہ ہو۔ ظلی ہو یا بروزی، تشریعی ہو یا غیر تشریعی ہر قسم کی نبوت ختم کر دی گئی مگر اس معنی سے نہیں کہ آئندہ نفوس انسانیہ کو کمال و تکمیل سے محروم کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اس معنی سے کہ اب یہ منصب ہی ختم کر دیا گیا ہے۔

صرف لفظ کا استعمال کافی نہیں | اگر کوئی جماعت صرف ختم نبوت کا لفظ تو استعمال کرتی ہے۔ مگر ان معنوں سے نہیں جن میں کہ عام مسلمان اس کو استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ تو محض اس لفظ کے استعمال کر لینے سے اس کو عام مسلمانوں کی جماعت میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ صرف جنت و دوزخ، نبوت اور معجزات کے الفاظ استعمال کرنے والے فلاسفہ کو صرف ان الفاظ کے استعمال کرنے سے مسلمانوں کے عقائد سے متفق نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ ان الفاظ کا استعمال ان ہی معنوں میں کرتے ہیں جن میں کہ تمام مسلمان ان کو استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ کیا نصاریٰ اور ہندو بھی توحید کا اقرار نہیں کرتے۔ مگر کیا صرف لفظ توحید کے استعمال کر لینے سے ان کو اسلامی توحید کا معتقد کہا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان و اسلام کیلئے یہ ضروری ہے کہ ان حقائق کو اپنے انہی معنوں میں مانا جائے جن میں کہ وہ ہمیشہ سے مسلمانوں میں مسلم رہے ہیں۔ صرف رسمی الفاظ کی نقالی بے سود ہے۔

ختم نبوت کی عقلی وجہ | سنت اللہ یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو ختم فرمانے کا ارادہ فرماتے

ہیں تو اس کو کامل کر کے ختم فرماتے ہیں۔ ناقص کو ختم نہیں فرماتے۔ نبوت بھی اپنے کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اس لئے مقدر یوں ہوا کہ اسکو بھی ختم کر دیا جائے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ختم نہ ہو بلکہ جاری رہے تو لازم آئے گا کہ ان کا خاتمہ نقصان پر ہو۔ ظاہر ہے کہ ایک نہ ایک دن عالم کا فنا ہونا ضروری ہے۔ اس سے قبل کسی نہ کسی نبی کا آخری نبی ہونا بھی عقلاً لازم ہے، اب اگر وہ آپ سے زیادہ کامل ہو تو اس کے لئے اسلامی عقیدہ میں گنجائش نہیں۔ اور اگر ناقص ہو تو خاتمہ نقصان پر تسلیم کرنا لازم ہوگا۔

تفصیل اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب فطرتِ عالم پر غور کیا جائے گا تو جزء و کل میں ایک حرکت نظر آئے گی۔ ہر حرکت ایک ارتقاء اور کمال کی متلاشی ہوتی ہے، پھر ایک حد پر پہنچ کر یہ حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہاں ختم ہوتی ہے وہی اس کا نقطۂ کمال کہلاتا ہے۔ انسان کی حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو وہ بھی نطفہ سے متحرک ہو کر دم، علقہ و مضغہ کے قالب طے کرتا ہوا خلق آخر پر جا کر ٹھہر جاتا ہے۔ اور اسی کو اسکی استعداد فطری کا کمال کہا جاتا ہے، پیدا ہونے کے بعد اس کے اعضاء میں پھر ایک حرکت اور ایک نشو و نما نظر آتا ہے اور وہ دورِ شباب پر مکمل ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ اور اسی کو اس کا زمانہ کمال کہا جاتا ہے، نباتات اور اشجار کو دیکھئے تو وہ بھی ایک چھوٹی سی گٹھلی سے حرکت کرتے کرتے ایک تناور درخت بن جاتا ہے آخر کار اس پر پھل نمودار ہوتے ہیں۔ اور جب وہ نمودار ہوتے ہیں تو یہ اس کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ اسی کمال پر پہنچ کر درخت کا ایک دورِ حیوٰۃ ختم ہو جاتا ہے، آئندہ اپنے دورِ حیوٰۃ کیلئے پھر اس کو بہت سے انہیں ادوار کو دہرانا پڑتا ہے۔ جن میں سے گذر کر وہ اس منزل تک پہنچا تھا۔ یعنی موسم خزاں آتا ہے اور اس کے دورِ حیوٰۃ کو ختم کر جاتا ہے۔ اگر قدرت کو اس کی پھر نشاۃِ ثانیہ منظور نہ ہوتی تو وہ یونہی سوکھ کر ختم ہو گیا ہوتا، مگر چونکہ اس کو ابھی باقی رکھنا منظور ہوتا ہے۔ اس لئے پھر اسے وہی سبز سبز پتیاں وہی ہری ہری لچکدار ڈالیاں مل جاتی ہیں۔ پھر اس پر پھول آتے ہیں اور آخر میں پھل نمودار ہوتے ہیں۔ جب تک یہ درخت موجود رہتا ہے اسی طرح اپنے ارتقائی مدارج کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوہرایا کرتا ہے۔ جو درخت اپنی ابتدائی کڑیوں کو پھر نہیں دوہراتے وہ ایک مرتبہ پھل دے کر اپنی زندگی ختم کر جاتے ہیں جیسے کیلا کا درخت ہے۔

اسی طرح سمجھا جائے کہ عالم نبوت میں بھی ایک تدریج نمایاں ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر تمام شریعتوں پر نظر ڈالئے تو معلوم ہو گا کہ تمام نبوتیں کسی ایک کمال کی جانب متحرک ہیں،

ہر پچھلی شریعت پہلی سے نسبتاً ارتقائی شکل میں نظر آتی ہے۔ اس لئے اس طبعی اصول کے مطابق ضروری ہے کہ یہ حرکت بھی کسی نقطہ پر جاکر ختم ہو جس کو اس کا کمال کہا جائے۔

لیکن جب خود نبوت ہمارے ادراک سے بالاتر حقیقت ہے تو اس کے آخری نقطہ کمال کا ادراک بدرجہ اولیٰ ہماری پرواز سے باہر ہونا چاہیئے۔ اس لئے ضروری ہے کہ قدرت خود اسکی کفالت فرمائے اور خود ہی اس کا اعلان کر دے کہ نبوت کا ارتقاء جہاں ختم ہوا ہے، وہ مرکزی اور کامل ہستی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ہستی ہے۔ قرآن کریم میں اس کا اعلان فرماتے ہوئے ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین کے بعد فرمایا ہے۔ وکان اللہ بکل شیء علیما۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو ہر چیز کا علم ہے وہ ہی یہ جانتا ہے کہ نبیوں میں خاتم النبیین اور آخری نبی کون ہے، یہ بات تمہاری دریافت سے باہر ہے کہ تم معلوم کر سکو کہ اس کے رسولوں کی مجموعی تعداد کتنی ہے ان میں اوّل کون ہے اور آخری کون ہے۔

نبوت نے اپنا مقصد پالیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نیا رسول نہیں آئے گا۔ کیونکہ اگر کوئی رسول آئے تو یا تو وہ آپ سے افضل ہوگا یا مفضول، اگر افضل ہو تو تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ نبوت نے ابھی تک اپنے اس کمال کو نہیں پایا جس کے لئے وہ متحرک ہوئی تھی اور اگر مفضول ہو تو کمال کے بعد پھر یہ نزولی حرکت اسی وقت مناسب ہو سکتی ہے جبکہ عالم کی پھر نشاۃ ثانیہ تسلیم کی جائے۔

لیکن چونکہ دنیا کی اجل مقدر پوری ہو چکی تھی اس لئے ضروری تھا کہ نبوت آخری اینٹ بھی لگا دی جائے اور اعلان کر دیا جائے کہ دنیا کی عمر کے ساتھ قصر نبوت کی بھی تکمیل ہو گئی ہے۔ اور نبوت نے اپنا مقصد پالیا ہے۔

ختم نبوت دینی ارتقاء اور خدا تعالیٰ کے انتہائی انعام کا اقتضاء ہے اور وہ کمال ہے کہ اس سے بڑھ کر امت کے لئے کوئی اور کمال نہیں ہو سکتا ہے۔ پھر حیرت ہے کہ اتنے عظیم الشان کمال کو برعکس محرومی سے کیسے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

دین اسلام کامل ہو چکا ہے اس کی روشنی اقصاء عالم میں پھیل چکی ہے۔ خدائی نعمت پوری ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی اور ہمیشہ کے لئے ایک اسلام ہی پسندیدہ دین ٹھہر چکا ہے۔ اس لئے آئندہ نہ گمراہی اتنا تسلط حاصل کر سکتی ہے کہ ہدایت کو فنا کر دے اور اس کے تمام چشمے خشک ہو جائیں، اس کی ایک کرن بھی چمکتی نہ رہے۔ اور نہ اس لئے کسی رسول کے آنے کی ضرورت

باقی ہے۔

ختم نبوت درحقیقت اس کا اعلان ہے کہ نورِ نبوت اب تمام عالم کو اسطرح روشن کر چکا ہے کہ اب کفر خواہ کتنا ہی سر پٹکے مگر وہ اس کے بجھانے سے بجھ نہیں سکتا۔ خدا کا اقرار اور اس کے صفات کی معرفت، غیب کا یقین، اب مجموعہ عالم کا اس طرح جزو بن چکے ہیں اگر کہیں اس مرتبہ پھر یہ معرفت ختم ہو گئی تو بس اس کے ساتھ ہی عالم کی روح بھی نکل جائے گی اور قیامت قائم ہو جائے گی۔

بڑی غلط فہمی | یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ ختم نبوت کو کمالات کے ختم کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ ہمارے اس بیان سے روشن ہو گیا کہ نبوت کا ختم ہونا تو خدائی نعمت کے اتمام اور دین کے انتہائی ارتقاء و عروج کی دلیل ہے، البتہ کمالات و برکات کا خاتمہ بلاشبہ محرومی ہوتی مگر روایات سے ثابت ہے کہ امت مرحومہ کے کمالات تمام امتوں سے زیادہ ہیں اور اتنے زیادہ ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے نبی کو بھی اس امت کے کمالات سن کر تمنا ہو سکتی ہے کہ وہ بھی اس امت کے ایک فرد ہوتے۔

ایک مغالطہ | ایک مغالطہ یہ ہے کہ ختم نبوت کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ نبوت کی بندش گویا آپ کی تشریف آوری کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اگر آپ تشریف نہ لاتے تو شاید کچھ اور افراد کو نبوت مل جاتی۔ یہ بھی انتہائی جہالت ہے، خاتم النبیین کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ سلسلہ انبیاء علیہم السلام میں آپ سب سے آخری نبی ہیں۔ اس لئے آپ کی آمد ہی اس وقت ہوئی ہے جبکہ انبیاء علیہم السلام کا ایک ایک فرد آچکا تھا۔ اس لئے آپ کی آمد نے نبوت کو بند نہیں کیا بلکہ جب نبوت ختم ہو گئی تو اس کی دلیل بن کر آپ تشریف لائے ہیں اور اس معنی سے آپ کو خاتم النبیین کہا گیا ہے۔ اگر علم ازلی میں کچھ اور افراد کیلئے نبوت مقدر ہوتی تو یقیناً آپ کی آمد کا زمانہ بھی ابھی اور مؤخر ہو جاتا۔

فاحش غلطی | سب سے زیادہ فاحش غلطی یہ ہے کہ اس پر غور نہیں کیا گیا کہ پہلے ایک نبی کے بعد دوسرا نبی کیوں آتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی نبوتیں خاص قوم اور خاص زمانہ کے لئے ہوتی تھیں، اس لئے ہر نبی کے بعد لامحالہ دوسرے نبی کی ضرورت باقی رہتی تھی، لیکن جب وہ نبی آگیا جسکی نبوت کسی خطہ، کسی قوم اور کسی زمانہ کے ساتھ مقید نہیں تو اب اس کے بعد نبوت کا سوال ایسا ہی ہے جیسا کہ اسکی موجودگی کے زمانہ میں۔

آپ کا دورۂ نبوت دوسرے انبیاء کی طرح ختم نہیں ہوا۔ بس درحقیقت نبوت تو اب بھی

باقی ہے اور وہ نبوت باقی ہے جو تمام نبوتوں سے کامل تر ہے ہاں نبی اور کوئی باقی نہیں رہا جب آپ کی نبوت باقی ہے تو اب جدید نبوت کا سوال خود بخود ختم ہو جاتا ہے ۔

ہنوز آں ابرِ رحمت در فشاں ست   خم و خمخانہ با مہر و نشاں ست

آپ کا تشریف لانا تمام جہان کیلئے رحمت ہے | اس کا مطلب یہ ہے کہ اب خاتم بذاتِ خود تمام جہان کے لئے رحمت بن کر آ گیا ہے اتنی بڑی رحمت کہ اس کے بعد کسی اور رحمت کی ضرورت نہیں ہو گی ۔ آج تک ہر رسول کے بعد دوسرے رسول کے انکار سے کفر کا خطرہ لگا رہتا تھا ۔ خاتم النبیین کی آمد سے یہ کتنی بڑی رحمت ہوتی کہ اس راستہ سے اب کفر کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہا نہ کسی اور رسول کے آنے کا امکان ہے نہ کسی کے انکار سے کفر کا اندیشہ باقی ہے ۔

بعثت عام اور ختم نبوت | اگر آپ کی بعثت عام نہ ہوتی اور نبوت ختم ہو جاتی تو آنے والی امت بغیر رسول کے رہ جاتی ، یہ بجائے رحمت کے ایک اور زحمت ہوتی ، اس لئے جب نبوت کا ختم ہونا مقدر ہوا تو آپ کی بعثت کا دامن قیامت تک کے انسانوں پر پھیلا دیا گیا ۔ تاکہ رہتی دنیا تک تمام انسان کامل و اکمل رسالت کے نیچے آ جائیں اور کسی دوسرے رسول کے محتاج نہ رہیں ، اور اگر آپ کی بعثت تو عام ہوتی مگر نبوت ختم نہ ہوتی تو اب آئندہ اگر کوئی اور کامل رسول آتا اور آپ کی بجائے اس کی اتباع لازم ہوتی ، تو آپ کا ناقص ہونا ثابت ہوتا ۔ ۔ ۔ (العیاذ باللہ) اور اگر کوئی ناقص رسول آتا تو کامل کے ہوتے ہوئے ناقص کے دامن میں آنا بجائے رحمت کے زحمت بن جاتا ۔ اس لئے بعثت عامہ کے بعد نبوت کا ختم ہونا ضروری اور لازمی ہو گیا ۔

ظلی بروزی نبوت کی کوئی قسم نہیں ہے | تاریخ نبوت پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو اس میں صرف دو ہی قسم کی نبوتیں ملتی ہیں ۔ ایک تشریعی ، دوسری غیر تشریعی اور یہ دونوں براہ راست نبوتیں ہیں تو اب نبوت کی ایک اور تیسری قسم (ظلی ، بروزی اور بالواسطہ نبوت) کا تراشنا تاریخ نبوت کے خلاف ہے ۔ قرآن و حدیث میں کوئی ایک آیت اور ایک حدیث بھی دستیاب نہیں ہو سکتی جس میں آنے والی امت میں سے کسی کو نبی کہا گیا ہو ۔ اور نہ ہی دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا نبی بتلایا جا سکتا ہے جو کسی نبی کے واسطہ اور اس کی اتباع کے صلہ میں انعامی طور پر نبی بنا دیا گیا ہو ۔

احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر قسم کی نبوت کی نفی کر دی گئی ہے ۔ اور کسی تفصیل کے بغیر لا نبی بعدی ، میرے بعد کوئی نبی نہیں ، کہہ دیا گیا ہے ۔ اس لئے آپ کے بعد

ہر مدعی نبوت کو کذاب و دجال کہا جا رہا ہے۔ کسی حدیث سے ظلی، بروزی، نبوت کی تقسیم ثابت نہیں ہوتی، پھر آخر کسی دلیل سے نبوت کی ایک تیسری قسم مان کر اس کو جاری قرار دیا جائے۔ کیا آیت خاتم النبیین کے عموم میں محض اختراعی تقسیم کی وجہ سے تخصیص پیدا کر کے قرآن کریم میں کھلی تحریف کا ارتکاب کر لیا جائے۔؟

فنافی الرسول اور اتباع کی وجہ سے بھی نبوت نہیں مل سکتی | اگر فنافی الرسول اور اتباع رسول کی وجہ سے کسی کو نبوت مل سکتی اور امت میں کوئی ہلکی سے ہلکی نبوت بھی جاری ہوتی تو صدیق اکبرؓ اور علی مرتضیٰؓ کو ضرور اس سے حصہ دیا جاتا مگر حالت یہ ہے کہ شب ہجرت میں حضرت علیؓ آپ کے بستر پہ ساری رات آپ کی جگہ قربان ہونے کے شوق میں پڑے ہوئے ہیں، صدیق اکبرؓ راستہ کے ہر خطرناک موقع پر سر بکف حاضر ہیں، مگر فنافی الرسول کے سمندر کے ان شناوروں کو نبوت کا چھوٹا سا چھوٹا موتی بھی ہاتھ نہیں آیا، بلکہ اگر کسی کے متعلق سیاق کلام میں نبوت کا کوئی ادنیٰ احتمال بھی پیدا ہوتا نظر آیا تو اس کو بڑی صفائی سے دور کر دیا گیا۔ اور کسی کے لئے غلط فہمی کی گنجائش نہیں دی گئی۔

اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک جاتے ہوئے حضرت علیؓ کو جب مدینہ منورہ میں اپنا جانشین بنایا اور اما ترضی ان تکون منی بمنزلہ ھارون من موسیٰ۔ میں اس علاقہ اور نسبت کا تذکرہ آیا جو صرف موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے درمیان تھا تو الا انہ لا نبوۃ بعدی۔ (رواہ مسلم) فرما کر اس غلط فہمی میں پڑنے سے امت کو بچا لیا کہ حضرت علیؓ کی خلافت و جانشینی بھی کہیں حضرت ہارون علیہ السلام کی طرح خلافت نبوت نہ ہو۔

تنبیہ | ایسی حدیثوں میں حضرت علیؓ کو حضرت ہارون علیہ السلام کی ذات گرامی سے تشبیہ دینا مقصود نہیں ہے۔ اسی لئے انت بمنزلہ ھارون۔ نہیں فرمایا بلکہ اس نسبت اور علاقہ سے تشبیہ مقصود ہے جو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے درمیان تھا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جسطرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی غیبت کے زمانہ میں، کوہ طور جاتے ہوئے اپنی قوم کی نگرانی کیلئے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کا انتخاب کیا تھا۔ اسی طرح اپنی غیبت میں تبوک جاتے ہوئے، میں تمہارا انتخاب کرتا ہوں۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ وہ نبی تھے، تم نبی نہیں ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر حضرت علیؓ کو نبوت ملتی تو وہ یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع ہی کی بدولت ملتی اور وہ ظلی بروزی نبوت کہلاتی، مگر جب اس احتمال کی بھی نفی کر دی گئی تو اب اتباع رسول

سے نبوت کے ملنے اور ظلی بروزی، مجازی، کسی طرح کی نبوت کا بھی احتمال باقی نہیں رہا۔

محدّث اور مکلّم بھی نبی نہیں ہوتے

حضرت علیؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت اخوت تھی اس کے باوجود نبی نہیں بن سکے یہ نسبت اخوت سے بڑھ کر ابنیت کی نسبت ہے گمان ہو سکتا تھا کہ آپ کا کوئی فرزند ہوتا تو شاید وہ نبی ہو جاتا۔ چنانچہ ان کے متعلق حدیث میں یہ ارشاد ملتا ہے لوعاش ابراھیم لکان صدیقاً نبیاء۔ اگر ابراہیم زندہ رہتے تو صدیق نبی ہوتے، لیکن جس ذات قدیر و حکیم نے ختم نبوت کو مقدر فرمایا تھا اس نے ان کے لئے عالم تقدیر میں۔ اتنی عمر ہی نہیں لکھی کہ ان کی علو استعداد ظاہر ہو سکے اور ختم نبوت سے ٹکرائے۔

حضرت عمر فاروقؓ کی فطرت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن اقدس سے وابستہ ہو جانے کے بعد۔ کمالات نبوت کا کیسا انعکاس ہوا تھا اور آپ کی فطرت کو نبوت سے کتنی مناسبت تھی وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے سایہ سے شیطان ترساں و لرزاں رہنے لگے تھے اور جس راستہ سے عمرؓ نکل جائیں، تو شیاطین وہ راستہ ہی چلنا چھوڑ دیا کرتے تھے وہ بولتے تھے تو بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ وحی آلہی ان کی موافقت میں بولتی تھی، وہ مُلہَم من اللہ اور محدّث امت تھے۔ مگر ان سب اوصاف و کمالات کے باوجود بھی ان کے بارہ میں حدیث میں آیا ہے: لوکان نبی من بعدی لکان عمر۔ اگر میرے بعد کوئی نبی ہو سکتا تو عمر ہوتا۔ اس سے یہ بات اور زیادہ صاف ہو جاتی ہے کہ محدّث اور مکلّم بھی نبی نہیں ہوتا۔

حضرت عمرؓ کا محدّث ہونا اور نبی نہ ہونا دونوں باتیں حدیث سے ثابت ہیں نتیجہ واضح ہے کہ محدّث نبی نہیں ہوتا۔ حدیث میں بھی من غیران یکونوا انبیاء، مگر وہ نبی نہ ہوتے تھے۔ کہہ کر محدّث کے نبی نہ ہونے کی تصریح کر دی گئی ہے۔

اب اس پر غور کیا جائے کہ حضرت عمرؓ اگر نبی کہلاتے تو ظاہر ہے کہ مجازی طور پر ہی کہلاتے مگر جب وہ بھی نبی نہیں کہلاتے تو پھر امت میں کسی دوسرے کو نبی کہلانے کا استحقاق اور جواز کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔؟

اگر مبشرات نبوت کا جزء ہیں تو کیا ان کو نبوت کہا جا سکتا ہے؟

احادیث میں ایک طرف تو رؤیا صالحہ کو نبوت کا چھیالیسواں جزء کہا گیا ہے: دوسری طرف بعض بلند اخلاق کو چھبیسواں جزء قرار دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے التؤدہ والاقتصاد وحسن السمت من ستة وعشرین

جزء من النبوۃ ، بردباری ومتانت ، میانہ روی اور اچھی روش نبوت کا چھبیسواں جزء ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان اخلاق کی وجہ سے کسی کو نبی نہیں کہا جا سکتا۔ جب چھبیسویں جزء کو نبوّت نہیں کہا جاتا تو چھیالیسویں جزء کو نبوت کیسے کہا جا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ جزء ہمیشہ اپنے کل کے مغائر ہوتا ہے دیکھئے یہی کلمات جن کا مجموعہ اذان کہلاتا ہے، علٰحدہ علٰحدہ اذان نہیں کہلاتے، عناصر اربعہ انسان کے اجزاء ہیں مگر ان میں سے کسی کو انسان نہیں کہا جاتا، مثلاً پانی انسان کا اہم حصّہ ہے مگر انسان نہیں ہے۔ تو رویا صالحہ نبوّت کا چھیالیسواں جزء ہو کر نبوت کیسے ہو سکتا ہے۔ ؟

افادہ | رویا صالحہ نبوت کے حقیقۃً اجزاء نہیں ہیں کیونکہ نبوت کسی ایسی حقیقتِ مرکبہ کا نام نہیں ہے جس کا تجزیہ وتحلیل ممکن ہو وہ ایک منصب ہے جس کا تعلق صرف خدائی اصطفاء اور اجتباء پر موقوف ہے۔ ہاں اس کے کچھ خصائص ولوازم ہیں جو اس کی ماہیت کا جزء نہیں ہوتے۔ کیونکہ اصطلاح میں خصائص واجزاء میں فرق ہوتا ہے۔ مگر اہل عرف کے نزدیک ان خصائص وفضائل ہی کو مجازاً اجزاء کہہ دیا جاتا ہے۔

| ختم نبوت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امت کمالات سے محروم ہوگئی | احادیث سے واضح ہے کہ اچھے خواب دیکھنا ، الہام ، اور فرشتوں کے ساتھ مکالمہ ، امت کا دینی |

اور دنیوی نظم ونسق قائم رکھنا ، یہ سب وظائف امت محمدیہ کے محدثین اور خلفاء کی طرف منتقل کر دئے گئے ہیں۔ اگر کہیں نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی تو یہ اپنے کمالات واستعداد کے لحاظ سے اس کے اہل تھے کہ انہیں منصب نبوت سے سرفراز کر دیا جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ امت محمدیہ میں بھی استعداد نبوت تو موجود ہے اور انسانی بلند سے بلند کمالات اسے حاصل ہو سکتے ہیں اس لئے ختم نبوت کا یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہئے کہ امّت کمالات سے محروم ہوگئی ہے۔ بلکہ تمام تر کمالات اور پوری استعداد ولیاقت کے باوصف اب چونکہ عہدہ نبوت پر تقرری کے لئے کوئی جگہ خالی نہیں رہی۔ اور منصب نبوّت کا عطا ہونا بند ہوگیا۔ اس لئے اس منصب پر کسی کا تقرر نہیں ہو سکتا۔

ظاہر ہے کہ کسی منصب پر تقرر کے لئے ذاتی استعداد اور قابلیت کے علاوہ تقرر کی جگہ کا خالی ہونا بھی شرط ہے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں نبی نہیں ہوئے اگر اس کی وجہ یہ ہوتی کہ ان حضرات میں اتنی لیاقت واستعداد بھی نہ تھی تو یقیناً یہ اس امت کا نقص شمار ہوتا لیکن

اگر تقرر کی کوئی جگہ ہی نہیں ہے تو اس میں امت محمدیہ کا کوئی قصور نہیں نکلتا ہے۔ یہ بات حکومت کے نظم و نسق کے متعلق ہے کہ وہ کسی عہدہ پر کتنے اشخاص کا تقرر کرنا چاہتی ہے۔

امتِ محمدیہ کے کمالات اور عظمت | اس سے امتِ محمدیہ کے کمالات اور عظمت کا اندازہ کرنا چاہیئے کہ جن خدمات کے لئے پہلے انبیاء علیہم السلام بھیجے جاتے تھے۔ اب اس امت کے علماء اور خلفاء اس کو انجام دیا کریں گے۔ اب غور کیا جائے کہ امتِ محمدیہ کی ہتک عزت اس میں ہے کہ اسے نااہل قرار دے کر اس میں نبی پیدا کیا جائے یا اس میں کہ اس کے خلفاء وہ خدمات انجام دیں جو پہلے کبھی انبیاء علیہم السلام اور فرمایا کرتے تھے۔

اسلام میں ختم نبوت کے عقیدہ کو بنیادی عقیدہ کی حیثیت حاصل ہے اس لئے آپ نے غور فرمایا کہ اس عقیدہ کی کس کس طرح حفاظت کی جا رہی ہے۔ اگر کہیں ذرا بھی اس بنیادی عقیدہ کو ٹھیس لگتی نظر آتی ہے تو فوراً صفائی کے ساتھ اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے اور معمولی سے ابہام کو بھی اس سلسلہ میں برداشت نہیں کیا گیا۔

رسولؐ کی حیثیت | اسلام میں رسول کی حیثیت کے متعلق ایک اصولی اور سب سے مقدس عقیدہ یہ ہے کہ اس کی ذات بابرکات امت کے لئے مرضیات الٰہیہ کا نمونہ اور اسوہ حسنہ بنا کر بھیجی جاتی ہے۔ اس کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہے کہ خالق جل وعلا کی نظر میں جتنی پسندیدہ صفات ہیں وہ سب کی سب اسکی ذات گرامی میں جمع کر دی جاتی ہیں اور جتنی صفات ناپسندیدہ ہیں وہ ایک ایک کر کے اسکی ذات عالیہ سے علیٰحدہ کر دی جاتی ہیں، کیونکہ کسی چیز کے نمونہ کہنے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ صاحب نمونہ کی پسندیدگی کا معیار ہے۔

حق تعالیٰ نے جہاں اپنی جانب سے اپنی کتاب قرآن کریم دے کر سرفراز فرمایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کتاب کا ایک عملی نمونہ بھی عنایت فرمایا تھا، اور وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ لہٰذا جسطرح اللہ کی کتاب ہر قسم کے عیب و نقص سے منزہ ہے۔ اسی طرح اس کا نمونہ بھی ہر عیب و نقص سے مبرا اور پاک و صاف ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب اللہ کی طرح صحابہ کرامؓ نے اسوہ رسول اللہ کو بھی اپنا پیشوا بنالیا، اللہ تعالیٰ نے رسول کی ذات گرامی کو اسوہ حسنہ فرمایا اور صحابہ کرامؓ نے کسی لیت و لعل کے بغیر آپ کو اپنا اسوہ بنالیا۔

اسوہ حسنہ رسول کی عصمت کا دوسرا مدلل عنوان ہے | اللہ تعالیٰ نے جسطرح تبلیغ احکام کیلئے آپ کو اپنا رسول بنا کر خود بھیجا تھا۔ اس طرح آپ کی ذات گرامی کو نمونہ اور اسوہ حسنہ بھی خود ہی بنا کر

بسیا تھا لہٰذا جسطرح آپ کے علوم کی قدرت ضامن تھی، اسی طرح آپ کے اعمال و افعال کی بھی قدرت ہی خود نگران تھی، اور عصمت رسول کا مفہوم بھی یہی ہے۔ لہٰذا اسوہ حسنہ کو رسول کی عصمت کا دوسرا مدلل عنوان سمجھنا چاہئے۔

اب اگر رسول کے کسی قول و عمل میں معصیت کی گنجائش تسلیم کر لی جائے تو دو باتوں میں سے ایک بات ماننی لازم ہوگی۔ یا رسول کی ذات اسوہ نہ رہے یا معصیت بھی اسوہ کا جزء بن جائے اور امتوں کے حق میں معصیت کا یہ عمل بھی مذموم نہ رہے۔ کیونکہ جب وہ معصیت خود قدرت کے نمونہ میں موجود ہوگی تو پھر اس کی اتباع پر امت سے باز پرس کیوں ہوگی، یہ دونوں باتیں ایک لمحہ کیلئے بھی قابل تسلیم نہیں اس لئے یہی بات تسلیم کرنی ہوگی کہ رسول چونکہ معصوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے کسی عمل پر معصیت کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس کا ہر ہر عمل نظر ربوبیت میں حسنہ اور نیکی شمار ہوتا ہے اور نیکی بھی وہ جسکو نمونہ کہا جا سکے۔

منکرین حدیث کا عقیدہ: ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب رسالت صرف تبلیغ قرآن پر ختم ہو جاتا ہے۔ گویا ان کے نزدیک آپ کی حیثیت ایک پوسٹ مین سے زیادہ نہیں تھی۔ (والعیاذ باللہ)

اب ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ قرآن کریم میں رسولؐ کی کیا حیثیت قرار دی گئی ہے، اوپر معلوم ہو چکا کہ منصب رسالت براہ راست خدا کے انتخاب پر موقوف ہے اور یہ کہ رسالت صرف وہبی ہے۔ بندوں کے کسب و اکتساب یعنی عبادات و ریاضات کو اس کے حصول میں کچھ دخل نہیں ہے۔ قدرت رسولوں کا انتخاب خود ہی کرتی ہے۔

قرآن کریم کی واضح آیات سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء اور رسولوں کی تعلیم و تربیت خود کرتے ہیں وہ ان کو خود پڑھا کر خود ہی یاد بھی کراتے ہیں۔ سنقرئک فلاتنسیٰ الا ماشاء اللہ۔ "ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہ بھولیں گے بجز اس کے جسکو خدا چاہے" پھر اس وحی کے بیان کی ان کی ذمہ داری بھی خود ہی اٹھاتے ہیں: ان علینا بیانہ۔ "اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے"، اور اس سے بڑھکر یہ کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے عواطف و میلان قلبی کی بھی نگرانی کرتے ہیں اور ان کے عزائم اور افعال قلبی خطرات کی بھی پوری نگرانی کی جاتی ہے۔ اس لئے امت ان کے متعلق معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتی ہے۔ لولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلا۔ اگر ہم آپ کو تھام نہ لیتے تو کچھ نہ کچھ آپ ان کی طرف جھک چلے تھے۔ اس ربانی تعلیم و تربیت عصمت

اور ہمہ وقت نگرانی کی وجہ سے نبیؐ کی جو بات ہوتی ہے۔ وہ خواہش نفس سے پاک اور صاف ہوتی ہے، اور انہیں رائے کی عصمت بھی حاصل ہوتی ہے۔ ارشاد ہے: وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی۔ وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا جو بولتا ہے وہ خدا کی وحی ہوتی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے۔ اور ارشاد ہے: انا انزلنا علیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ۔ ہم نے آپ پر قرآن سچائی کے ساتھ اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے معاملات میں اس رائے کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھائے۔ رسولؐ کے سوا کسی کے ساتھ یہ وعدہ نہیں ہے کہ مخلوق میں فیصلہ کیلئے اللہ تعالیٰ خود ان میں سمجھ پیدا کر دیتا ہے۔ یہ رائے کی عصمت انہیں کے ساتھ مخصوص ہے۔

آیت وما ینطق عن الھوی کے معنی | منکرین حدیث اس آیت کریمہ کو صرف قرآن مجید کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں۔ حالانکہ یہاں رسول کی صفت نطق کی مطلقاً مدح مقصود ہے۔ قرآن کریم پڑھنے کے لئے تمام جگہ تلاوت یا قرأت کا لفظ مستعمل ہوا ہے اگر یہاں قرآن مراد ہوتا تو وما ینطق کی جگہ وما یتلو یا وما یقراء کا لفظ ہونا چاہیئے تھا۔ منکرین حدیث چونکہ حدیث کے سرے سے مخالف ہیں اس لئے وہ رسولؐ کو کسی ایسی صفت کے ساتھ موصوف دیکھنا نہیں چاہتے جس کے بعد اس کو عام امراء و حکام سے کوئی خصوصی امتیاز حاصل ہو جائے۔

اصل یہ ہے کہ رسولؐ اپنی ذات اور تمام صفات میں عام انسانوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے کان وہ کچھ سنتے ہیں جو عام مخلوق کے کان نہیں سنتے۔ اس کی آنکھ وہ دیکھتی ہے جو عام آنکھیں نہیں دیکھتیں۔ اسی لئے فرمایا: انی اری مالا ترون، میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے، اسی لئے آپ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس منہ سے حق بات کے سوا کبھی کچھ نہیں نکلتا، حتیٰ کہ اپنی خوش طبعی کے متعلق بھی فرمایا ہے۔ انی لا اقول الاحقا۔ میں خوش طبعی میں بھی سچی بات کہتا ہوں، اس لئے فرمایا کہ غصہ اور رضامندی کے ہر حال میں جو میرے منہ سے نکلے سب لکھ لو۔ وہ حق ہی حق ہوگا۔ جب اس کے عام نطق کا حال یہ ہے تو جو قرآن اس کی زبان سے نکلتا ہے۔ وہ صدق و صفا کی کس منزل پر ہوگا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس جگہ قرآن نے آپ کے کسی خاص بات کہنے کے متعلق صفائی پیش نہیں کی یعنی وما ینطق بالقرآن، وغیرہ نہیں فرمایا بلکہ مفعول کو حذف کیا ہے۔ لہذا بلاغت کے قاعدہ کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں مفعول مقصود ہی نہیں بلکہ صرف آپؐ کی صفت نطق کی پاکیزگی بتلانا منظور ہے۔ دیکھیے تفتازانیؒ کی وہ تقریر جو انہوں نے ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون۔ میں کی ہے۔ (باقی آئندہ)

قارئین کے خطوط

افکار و تاثرات

حالیہ بحران اور مار آستین قادیانیت | الحق کے شمارہ رمضان میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ لائقِ تحسین و ستائش جرأتِ اظہار کا وہ جذبہ بے پناہ ہے جو "نقشِ آغاز" کے پہلے موضوع کے مباحث میں خوب خوب نمایاں ہوا ہے اور جس کے ذریعہ آپ نے قوم کو اس خائن و بدسرشت گروہ کے نمائندہ عوامل کیطرف سے متنبہ فرمایا ہے۔ اس خصوص میں پروفیسر شاہد تسنیم کے تحقیقی مطالعات کا نقشِ اول بھی ایک اہم مساعی۔ قبلۂ امم! واقعہ یہ ہے کہ ملک کے اقتدارِ اعلیٰ کی مشینری پر اس بدنہاد گروہ کا قبضہ و تسلط نہایت درجہ وسیع و عریض اور دور رس ہے۔ جس کے پیشِ نظر فی نفسہٖ یہ اقدامات ناکافی بھی محسوس ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ کسی ایک شعبۂ حکومت پر اس کی گرفت کو محدود سمجھ کر اس پر ابنائے وطن کی توجہ مبذول کرائی جائے یا تاریخی تحقیق اور تحقیقِ مزید کی رو سے مسیلمۂ عصر کی باطل پرست کارگزاریوں کی یاد دہانی کو ایک مسلسل عمل کی شکل دی جائے۔ ضرورت کم ازکم اس امر کی ہے کہ حالیہ المناک ترین بحران اور سنگین ترین المیے میں اس گروہ کے کارفرما رول سے الحق کے وسیع حلقۂ اثر کے ذریعے عامۃ المسلمین کو براہ راست اور زیادہ سے زیادہ واقف کرایا جائے۔ اس رول کو پہلے سے بھانپ کر اس کو پوری طرح ایکسپوز کیا جانا چاہیئے تھا۔ مگر اب بھی دیر نہیں ہوئی اور بلاتاخیر اس کی انتہائی تباہ کن کارگزاریوں اور مہلک قوم منصوبہ بندیوں سے اہلِ ملت کو متنبہ کرنے کا وقت گزر نہیں گیا۔ آسمانوں پہ پھیلا ہوا سبز ہلالی پرچم دو ٹکڑے ہو چکا ہے۔ مگر جسدِ ملت کا جو ٹکڑا ابھی گرگِ اجل کے ہاتھوں سے محفوظ و مامون ہے۔ اب اس کے پارہ پارہ کرنے کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی ہیں۔ آپ اس لئے ملت کو اس مقتدر و مسلط خطرے سے واشگاف لفظوں میں آگاہ کیجئے نیز صاف صاف بتائیے کہ "ترقی پسند" اور "نمائندۂ عوام" خوشنما چہروں کو ساتھ ملا کر ان کی آڑ میں نبی کاذب کے دشمنِ دین و ایمان پیرو اب تباہ کاری کا کون سا بدانجام خونی ڈراما کھیلنے والے ہیں۔ تخریب و انتشار طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کے تین ارتکائی مدارج سے گزار کر بچی کھچی قوم اور اس کے زخم خوردہ محافظوں کو ضعف و بے چارگی کے اس نقطۂ عروج پر پہنچایا جانے والا ہے۔ جہاں یہ لاوا خود بخود بیرونی دشمن کو دعوتِ تاخت دے گا اور پھر یہ ساری اندرونی و بیرونی کشاکش اس جاں بلب مریض کی آخری ہچکی کا سامان کر دے گی۔ عاجز کا وجدان کہتا ہے۔

کہ اس پورے سلسلۂ عمل کے رونما ہونے میں بیش از بیش چند ماہ کا عرصہ لگے گا۔ الا اس کے کہ اعلائے کلمۃ الحق کے آپ سے جسور و بے باک داعی اٹھ کھڑے ہوں کہ اس معیار پر ملت کو خواب گراں سے جھنجھوڑ کر اس کی سر بریدگی کے فیصلے سے باز آنے پر متنبہ کریں۔ کچھ عجب نہیں جو مسلمانوں کی میراث صادق کے غاصب ہی کاذب کے مبلغین بعجلت یا مختصر وقفے سے "عوامی نمائندہ" اور "ترقی پسند" چہروں کی اوٹ سے نکل آئیں اور آستین ملت میں درزدانہ گھس بیٹھنے والے ان سانپوں کو قوم نقاب برانگندہ دیکھ لے لیکن ظاہر ہے کہ قومی زندگی کا وہ ایک خواب آشنام لمحہ ہوگا۔ اور اس سے پہلے پہلے ہی ان کے منہ پر سے نقاب نوچ پھینکنی چاہئے۔

دوسری چیز جس پر اپنے حقیر معروضات آپ کے ملاحظہ میں گزارنے ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے۔ کہ اسی حزب الشیطان کے نیاز مند ایک چھوٹے لیکن نقصان رساں گروہ کے بارے میں ایک مقام پر اغلباً بوجہ عدم واقفیت خوش عقیدگی کا اظہار ہو گیا ہے۔ محترم جناب اختر راہی صاحب نے نام نہاد "ورج وار الحکیم" کی کتاب "الہامی چشتی گرنیاں" پر تبصرے میں اس ادارے اس کے بانی اور پاکستان میں اس کی تنظیم کے تئیں حسن ظن کا اظہار فرمایا ہے۔ حقیقت حال مختصر لفظوں میں یوں ہے کہ صدیق دین دار چن بسویشور، جو کبھی دین حق کا ایک داعی کاذب اور رئیس قادیان کی جعلی نبوت کا امتی گزرا ہے۔ اس نے جنوبی ہند کے پسماندہ ہندو قبائل کے نظریہ ظہور چن بسویشور کو ڈیسپلائیٹ کر کے ہندو بہا[illegible] نیز داعی اسلام کا نیز بیک وقت مسلمانوں میں اپنی پوزیشن کی حفاظت اور وسیع اثر کے مد نظر "مبلغ اسلام اور دین دار" کا روپ دھارا۔ ہندوؤں کو کثیر تعداد میں اپنے خود ساختہ مسلک پر لانے کی خاطر اس نے دین حق میں تحریف کا ارتکاب کیا اور دوسری طرف مسلمان جہلا میں اپنی مقبولیت بڑھانے کے لئے ہندوانی رسوم و رواجات کی اشاعت کی۔ اس کا مذہب ایک نامعقول امتزاج سے عبارت تھا اور مسلمانان دکن کے سارے مذہبی و مسلکی گروہوں کے ارباب اختیار نے متفق علیہ طور پر اس کی تکذیب و تکفیر کی۔

اس خصوص میں ایک مختصر تحریر الگ سے حاضر خدمت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ انشاء اللہ العزیز

استاذ الاساتذہ مولانا رسول خان علیہ رحمۃ پر حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کا مقالہ گرامی نہایت پر مغز اور معلومات آفریں ہے۔ حضرت علامہ کا نقش جمیل آنکھوں میں پھر گیا۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے افادات عالیہ میں سے کامیاب و بامراد زندگی بے نظیر اور نہایت درجہ دلکش و موثر ارشادات ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس روشن رہبری و رہنمائی کے لئے حضرت کا سایۂ اقدس ہم لیے پر مساعی ارادت مندوں پر دائم و قائم رکھے۔ آمین۔ (عزیز احمد کراچی)

تربیت السالک کی ترتیب

حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین تربیت السالک کی تبویب حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی جو بہت دراز ہوئی کہ طبع ہوئی تھی اس میں ۱۳۵۰ھ تک کے مضامین جو تھانہ بھون کے رسالہ "النور" میں شائع ہوتے رہے غیر مبوب تھے۔ (بعد کے مضامین کی تبویب ہوئی تھی) ان مضامین کی تبویب کا خیال بھی حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو آیا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی نشاندہی فرما کر فہرست مضامین مکمل کر کے اس ناکارہ کو تکمیل کا حکم فرمایا۔ چنانچہ حضرت کی حیات مقدسہ ہی میں یہ تمام مضامین تبویب تربیت السالک جلد دوم قریباً مکمل ہو گئے تھے صرف چند ورق باقی تھے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ واصل بحق ہو گئے۔

حضرت والا کی وفات حسرت آیات کے بعد یہ سب مسودات مکمل ہو کر طباعت کیلئے تیار ہو گئے۔ حضرت قدس سرہ کے حکم اور خواہش کے مطابق یہ مسودات حضرت مولانا محمد شفیع صاحب اور حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کی خدمت میں بھیجے گئے۔ دونوں حضرات مخدومین نے تصویب فرمائی اور دعاؤں سے نوازا۔ اب الحمدللہ کتاب تبویب تربیت السالک جلد دوم زیر کتابت ہے۔ کتابت آفسٹ کی ہو رہی ہے۔ والسلام۔ محمد عبدالسلام ہوشیارپوری عفی عنہ

انجمن اشاعت العلوم جامع مسجد کچہری بازار لائلپور

معذرت

ہمیں افسوس ہے کہ ہزار کوشش اور ارادوں کے باوجود الحق کی اشاعت اپنے وقت پر نہیں لا سکے مقامی طور پر کتابت وطباعت کی دشواریاں اور مسلسل ہنگامی حالات اور کاغذ کی انتہائی کمیابی اور گرانی کے باوجود ہم نے نہ اس کی ضخامت کو گھٹایا نہ کاغذ کا معیار ہی۔ گنا داموں پر خرید کر بھی قائم رکھا پھر بھی ہم اپنے قارئین سے شرمندہ ہیں کہ ہر ماہ پرچہ کی تاخیر کی وجہ سے انہیں زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ پچھلے دو ماہ کے حالات کا نتیجہ ہے کہ ہم اس دفعہ جنوری اور فروری کا شمارہ یکجا شائع کر رہے ہیں اور اس طرح اللہ سے امید ہے کہ اگلا پرچہ مارچ کا شمارہ اپنے وقت یعنی مہینہ کی ابتداء میں شائع ہو سکے گا۔ امید ہے کہ فروری کے الگ شمارہ کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ (ادارہ)

سنا ہے دو جرنیلوں کو ترقی دیکر لیفٹیننٹ جنرل بنا دیا گیا ہے۔ جن میں سے ہر جنرل کور کمانڈر ہو کر دو سے تین ڈویژنوں کی کمان کرتا ہے۔ اور یہ دونوں مصدقہ طور پر مرزائیت سے تعلق رکھتے ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ مرزا کو نہ ماننے والے تمام مسلمان کافر اور عقیدہ جہاد رکھنا حرام ہے پھر کیا ایسے نازک معاملہ میں ہماری خاموشی ملک و ملت سے غداری نہ ہو گی ایک ابن علقمی اور دوسرے متنبی کذاب کے پوتے کی وجہ سے ملک کی نیا ڈوب گئی اور جو خاموش تھے انہیں آج کلمۂ حق نہ کہنے پر بزدلی کے طعنے دئے جاتے ہیں پھر کیا آج بھی یہی مصلحت کیشیاں ہمیں لے نہیں ڈوبیں گی کیا ہم مزید تجربوں کے متحمل ہیں کیا اس معاملہ میں اظہار حق ملک کی خیر خواہی ہے یا سکوت مجرمانہ؟

سمیع الحق

جمع کردہ حضرت خواجہ نور بخش صاحبؒ مبلغ شریعت
ارسال کردہ: محمد عبدالرشید خلیفہ حضرت مولانا عبدالغفور عباسیؒ

ملفوظات

حضرۃ خواجہ محمد فضل علی شاہ قریشی نقشبندی مجددی مسکین پوریؒ

★ ★ ★

طالب حق کیلئے استقامت کا ہونا ضروری ہے۔

فرمایا ؎ اے پسر راہ شریعت پیش گیر
زود تر ترک ہوائے نفس گیر

افسوس! غفلت نے تم کو گھیر رکھا ہے کیا تم نے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے آزادی کا کوئی پروانہ حاصل کر لیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو وہ پروانہ مجھے بھی تو دکھاؤ اگر ایسا نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کو یاد کرو، اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت نہ برتو۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔

غور کا مقام ہے کہ ہمارے ہادی معصوم حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، یتیم ابو طالب محبوب کبریا تو ساری ساری رات نوافل پڑھتے، اللہ تعالیٰ کو اتنا یاد کرتے کہ آپ کے پاؤں مبارک پر ورم آجاتا۔ محبوبؐ کو تو اتنا خدا تعالیٰ کا خوف ہے۔ اور آپ کی امت اتنی غافل ہے۔ کہ عبادت کی پرواہ نہیں۔ حضور علیہ السلام جو کی روٹی کھا کر ساری رات عبادت کرتے اور اپنی امت کے لئے مغفرت کی دعائیں مانگتے۔ مگر افسوس امت کا حال یہ ہے کہ مرغن غذائیں کھاتی ہے، سونے کے لئے عمدہ بستر اور پلنگ ہیں۔ باوجود ان انعامات کے نوافل پڑھنے کا ذکر تو درکنار پنجگانہ فرض نمازیں بھی ادا نہیں کرتی۔

اللہ تعالیٰ کے انعامات تم پر بیشمار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھیڑ بکری وغیرہ تمہارے لئے حلال کر دی، تم گنہگار ہو، انہیں ذبح کر کے کھاتے ہو۔ اس جہان کی سب چیزیں تمہاری خاطر بنائیں۔ اپنی نعمتوں کے طرح طرح کے خزانے تم کو عطا فرمائے۔ مگر تم ان نعمتوں کا حق ادا نہیں کرتے۔

اگر تم کو کوئی شخص ایک لاکھ روپیہ دے اور کہے کہ اس کے عوض تم ایک آنکھ نکال کر اسے دے دو۔ تو تم ایسا کرنے کے لئے تیار نہ ہوگے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ کہ اس نے

تمہیں دو قندیلیں (آنکھیں) عطا فرمائیں۔ رات دن ان سے تم دیکھ رہے ہو۔ ان میں تیل ڈالنے کی حاجت نہیں، بلا قیمت اور بلا محنت یہ تم کو ملی ہیں۔ کیا خدا تعالیٰ کو تم نے کوئی رقم دی ہے۔؟ اے عاجز اور کمزور انسان! تیرا سارا وجود خدا تعالیٰ کے احسانوں سے بھرا ہوا ہے۔ اگر تیری عمر حضرت نوح علیہ السلام کی عمر جتنی بھی ہو تو تو اللہ تعالیٰ کے احسانوں کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔

ایک مثال بیان کرنے سے تمہیں اللہ تعالیٰ کے احسانات کا اندازہ لگ جائے گا۔ دیکھو اگر کوئی شخص تمہاری گردن پکڑلے اور تمہیں ہلاک کرنے کا قصد کرے۔ تو تم اپنی جان بچانے کے لئے سب مال و اسباب دینے کے لئے تیار ہو جاؤ گے۔ اہل و عیال بھی دینے سے دریغ نہ کرو گے۔ سب کچھ دیکر اپنی جان بچانے کی فکر کرو گے کہ کسی طرح میری جان بچ جائے۔ لہٰذا دنیا کا سب مال ایک سانس کی قیمت ٹھہری۔ رات دن میں تم چوبیس ہزار بار سانس لیتے ہو۔ اب انہیں کیوں مفت میں ضائع کرتے ہو۔ ہر سانس بڑی قیمت والی چیز ہے۔ اس قیمتی متاع کو انسان خرچ کر رہا ہے۔ اگر ہر سانس قیمتاً خریدتا تو قدر جانتا کہ یہ کتنی گراں بہا نعمت ہے۔ بزرگان دین ایک ایک سانس کے ساتھ چار بار شکر کرتے ہیں اور ہر سانس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اسے ذکر الٰہی سے خالی نہیں جانے دیتے۔ سانس کی قدر بزرگان دین نے سمجھی ہے۔ ایک ایک سانس میں چار چار مرتبہ اللہ اللہ کر لیتے ہیں۔

کیا تم سے اللہ تعالیٰ سوال نہیں کرے گا۔

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝ پھر اس دن تم سے نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔

کیا تم نے یہ آیت قرآن مجید میں نہیں پڑھی ـــــ تم قرآن مجید کی عظمت اور قدر سے غافل ہو۔ دو موقعوں پر تم اسے ہاتھ لگاتے ہو۔ ایک قسم اٹھاتے وقت چور نے جوتا چرایا اسے بھوسے میں چھپا رکھا ہے۔ اور ایک جوتے کے لئے قرآن کریم پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی قسم اٹھا رہا ہے کہ میں نے جوتا نہیں چرایا۔ دوسرا تمہارا جب کوئی عزیز مرتا ہے تو ملاں تھوڑی رقم سے کر مردے کو ایمان لے دیتا ہے۔ ملاں اس طرح قرآن کی قدر نہیں کرتا۔

قرآن گھر میں طاقچہ میں رکھا ہوا ہے اس پر مٹی جم رہی ہے۔ مگر گھر والا اسے ہاتھ نہیں لگاتا۔ اپنی عورت کے حیض بھرے کپڑے تو صندوق میں رکھتا ہے۔ ہفتہ وار انہیں دیکھتا ہے، دھوپ میں رکھتا ہے تاکہ کسی کپڑے کو کیڑا نہ کھا جائے۔ افسوس تیری اس مسلمانی پہ۔ جیسا تو برباد ہوا ہے ایسا اور کوئی نہیں ہوا۔ نہ تو مسجد میں جاتا ہے۔ اور نہ ہی قرآن کریم کی تلاوت کرتا ہے۔ یہ دونوں تجھے بددعا

دے رہے ہیں۔ قیامت کے دن یہ دونوں تیری شکایت کریں گے۔ بھلا بتاؤ کس کا حق ہے فریاد کرنے کا۔؟ کیا مسجد تم کو آنے نہیں دیتی یا تم مسجد میں نہیں جاتے۔؟ کیا قرآن شریف تم خود نہیں پڑھتے یا قرآن کریم تم کو پڑھنے نہیں دیتا۔؟ اب بتاؤ کون فریاد کرے گا اور کس کی فریاد سنی جائے گی۔ اس وقت تمہارا کوئی عذر نہ چل سکے گا۔

جس وقت کوئی مصیبت آتی ہے یا مرض لاحق ہو جاتا ہے تو اس وقت تو مسجد کیطرف بھاگتا ہے منافقانہ۔ جب مصیبت ٹل گئی یا مرض سے شفا حاصل ہو گئی۔ تو بیوی اپنے مرد کو لے کر "سخی سرور" کی قبر پہ جاتی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کا نام بھول جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام یاد نہیں رہتے، کہتے ہیں:

"اے سخی سرور! فلاں مصیبت یا بلا تو نے ٹالی ہے۔"

لوگ تھوڑا سا ذکر کر کے ترقی کے خواہاں ہیں۔ ذکر فکر مداری کا تماشہ نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا ط وان اللہ لمع المحسنین۔ (العنکبوت آیت ۶۹)	اور جنہوں نے ہمارے لئے کوشش کی ہم انہیں ضرور اپنی راہیں سمجھا دیں گے اور بیشک اللہ نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔

لہٰذا تم کوشش کرو، راستہ کھل جائے گا۔ آج کل تو بہت آسان کام ہے۔ پہلے وقت کے مشائخ بہت محنت کراتے تھے، محنت کرتے کرتے جب کسی کا قلب ذکر میں شاغل ہو جاتا تو وہ بڑے مشائخ میں سے گنا جاتا تھا۔

کوئی شخص زراعت کرتا ہے اگر ایک فصل نہیں ہوتی تو کیا وہ زراعت کرنا چھوڑ دیتا ہے؟ ہرگز نہیں، بلکہ وہ اس میں پہلے سے زیادہ محنت کرتا ہے۔ دہقان بھی اتنی عقل رکھتا ہے کہ خراب زمین میں زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم بھی ذکر اذکار میں زیادہ محنت کرو۔ ذکر میں ثمرات کے طالب نہ بنو، مقصود رضائے الٰہی ہے۔ مرتے دم تک طلب نہ چھوڑو۔

واعبد ربک حتیٰ یاتیک الیقین۔ (الحجر آیت ۹۹)	اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہو یہاں تک کہ تمہیں موت آجائے۔

گر نشاید بدوست رہ بردن	شرط عشق است در طلب مردن
اوحدی سی سال سختی دید	تا شبے روئے نیک بختی دید

حضرت امام ربانی صاحب فرماتے ہیں : "ما فضلیانیم در طریقہ" ما محرومی نیست آخر خواہند داد"
کسی کو قبر میں فیض پہنچتا ہے۔ کسی کو آخرت میں پہنچیگا۔ یہ طریقہ بڑے فیض والا ہے۔ اس طریقہ کا پیرو محروم نہیں رہتا۔ آپ استقامت حاصل کرو۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ	بیشک جنہوں نے کہا تھا کہ ہمارا رب
اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ	اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے ان پر
الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا	فرشتے اتریں گے کہ تم خوف نہ کرو
وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ	اور نہ غم کرو۔ اور جنت میں خوش رہو جس
تُوْعَدُوْنَ۔	کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔
الاستقامۃ فوق الکرامۃ۔	استقامۃ کرامت سے بڑھ کر ہے۔

ہمارے حضرت فرماتے ہیں : ما برائے استقامت آمدیم
نے بئے کشف وکرامت آمدیم
آپ کشف وکرامت کے طالب نہ بنو۔ ذکر واذکار میں کوشش کرو۔ اور اس میں استقامت حاصل کرو۔
حضرت ابوبکر شبلیؒ حضرت جنیدؒ کی خدمت میں گئے۔ سارا سال خدمت میں رہے۔ حضرت شیخ نے آپ سے کچھ نہ پوچھا۔ ایک سال کے بعد پوچھا کہ اے لڑکے کہاں سے آئے ہو۔ تو آپ نے جواب دیا: شبل سے ہے۔ اس سے زیادہ حضرت شیخ نے کلام نہ فرمایا جب دوسرا سال گزر گیا تو دریافت فرمایا کہ تمہارا نام کیا ہے ؟ آپ نے فرمایا حضرت میرا نام ابوبکر ہے۔ جب تیسرا سال گذر گیا تو آپ نے پوچھا کہ میرے پاس آنے کا کیا مقصد ہے ؟
حضرت ابوبکرؒ نے عرض کیا کہ حضرت اللہ تعالیٰ کا نام پوچھنے آیا ہوں۔ لہٰذا تین سال کے بعد حضرت جنیدؒ نے مہربانی فرمائی۔ دیکھئے تین سال میں حضرت شیخؒ نے تین کلمات فرمائے اس سے حضرت شبلیؒ کی استقامت کا اندازہ لگائیے کہ تین سال حضرت شیخ نے کوئی کلام آپ کے ساتھ نہ کی۔ مگر آپ اسی خیال میں مطمئن رہے کہ حضرت شیخ کسی نہ کسی وقت ضرور توجہ کرم فرمائیں گے۔ آپ نے اپنی خوش اعتقادی میں سر مو جتنا بھی فرق آنے نہ دیا۔
آج کل تو حالات بالکل برعکس ہیں۔ لوگ بزرگ کی خدمت میں آکر کہتے ہیں۔ حضرت !

جلدی کرو، فیض دو۔ آج ہی مجھے گھر واپس لوٹنا ہے۔ دوسرا ساتھ یہ بھی بتلاتا ہے کہ حضرت میں نے بہت بزرگ ڈھونڈے ہیں۔ تیسری بات یہ کہتا ہے کہ مجھے جذبہ بھی آج ہی ہو جائے اور میری گھروالی میرے اوپر مہربان رہے۔
چوتھی عرض یہ بھی ہے کہ مجھے دنیاوی مال و اسباب فراوانی سے ملے۔ پانچواں سوال یہ ہے کہ مجھے کوئی "مسخرات" کا وظیفہ بھی بتلا دیجئے۔ مگر حضرت جلدی فرمائیں کیونکہ مجھے گھر جانا ہے۔
یہ ہے اس زمانے کے لوگوں کا حال۔ اگر انہیں "ذکر الٰہی" بتایا جاتا ہے۔ تو جواب دیتے ہیں۔ کہ ذکر کرنے کی مجھ سے ہمت نہیں ہو سکتی، مجھ سے ذکر و فکر نہیں ہو سکتا۔ آپ ہی کایا پلٹ دیں۔ وہ بھی سب کچھ ایک بار ہی کر دیں۔ بھلا بتاؤ ایسے مرید کو شیخ کیسے فیض یاب کر سکتا ہے وہ کوئی اسرافیل تو نہیں کہ ایک پھونک مارے۔ عجلت ایسی ہے کہ ابھی معراج کی تیاری ہے۔ مگر محنت کرنے کو تیار نہیں۔ صرف یہ تمنا ہے کہ شیخ ایک پھونک مارے اور سب کچھ حاصل ہو جائے۔
بھلا بتاؤ مسافر کو اگر راستہ بتا دیا جائے اور وہ اس پہ گامزن نہ ہو تو ایسا کم ہمت مسافر منزلِ مقصود پر کیسے پہنچے گا۔ لوگوں کے دلوں میں کیسے غلط خیالات جم گئے ہیں۔
ہمارے بزرگوں کی ہمتوں کا حال دیکھئے، حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کے بارے میں کہتے ہیں کہ حضرت عثمان ہارونیؒ کی خدمت میں تین برس تک رہے۔ اس طویل عرصے میں حضرت شیخؒ نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو۔ مگر حضرت معین الدینؒ کی استقامت رنگ لائی اور تین سال کے بعد حضرت شیخؒ نے مہربانی فرمائی۔ اس طرح کے بہت سے بزرگوں کے احوال ہیں۔
طالب میں طلب کا مادہ ہونا چاہیئے، طلب ہو تو مطلوب ملتا ہے ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست
تا بیابد آبت بالا و پست

کوشش کرو، اللہ تعالیٰ کے راستے میں محنت کرو۔ حضرت باقی باللہؒ رات کو مراقبہ میں بیٹھتے تو صبح ہو جاتی۔ صبح کو فرماتے افسوس رات چھوٹی ہے۔ سچ ہے ؎

بندہ آمد از برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

فرمایا: طالب کو لوگوں کی ملامت سے نہ ڈرنا چاہیئے۔ ذکر اذکار میں لگے رہنا چاہیئے۔ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (المائدہ ۵:۵۴) اور ڈرتے نہیں کسی کے الزام سے۔

لوگوں کے کہنے سننے میں آکر اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ چھوڑنا چاہیئے۔ جذب ہو جائے تو بند نہ کریں۔ اور مشت سے کم ڈاڑھی کبھی نہ کٹانی چاہیئے۔

تہجد کی نماز دو دو رکعت پڑھے۔ اوّل رکعت میں بارہ مرتبہ قل شریف پڑھے۔ دوسری رکعت میں گیارہ بار۔ اسی طرح ہر رکعت میں ایک ایک قل شریف کم کرتا جائے حتیٰ کہ بارھویں رکعت میں ایک بار قل شریف پڑھے۔ بعض یوں بھی پڑھتے ہیں کہ پہلی رکعت میں ایک بار قل شریف پڑھتے ہیں۔ دوسری رکعت میں دو بار، علیٰ ہذالقیاس بارھویں رکعت میں بارہ مرتبہ پڑھتے ہیں۔ مگر اس سے پہلا طریقہ بہتر ہے۔ مگر ہمارے بزرگ فرماتے ہیں کہ اچھا تو یہ ہے۔ کہ تین دل اکٹھے ہو جائیں رات کا دل، مومن کا دل اور قرآن حکیم کا دل یعنی سورۃ یٰسین پڑھے۔

پہلے لوگوں میں دین کی بڑی محبت تھی، ایک دفعہ خلیفۂ بغداد کی ماں نے کہا کہ اے فرزند تیرا ملک عنقریب غرق ہونے والا ہے۔ خلیفہ نے پوچھا اماں کیوں۔ ماں نے کہا کہ بیٹا آج تیرے محلہ والی مسجد میں صرف ستر عورتیں تہجد نماز پڑھنے آئیں۔ جلد انتظام کرو۔ دوسری عورتیں کیوں نہیں آئیں۔ کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دوگے۔ فرمایا، وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط۔ (عنکبوت - ۶۹) جنہوں نے ہمارے لئے کوشش کی ہم انہیں ضرور اپنی راہیں سجھا دیں گے۔

جو کوئی اللہ تعالیٰ کے راستے میں قدم رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا ہادی بن جاتا ہے۔ آپ ذکر کریں ضرور فائدہ ہوگا۔ فرمایا: بھرے ہوئے برتن کو کون بھر سکتا ہے۔ وہ تو پہلے ہی بھرا ہوا ہے۔ خالی برتن کو بھرتے ہیں۔ جب تک طالب کا دل تکبر و غرور اور انانیت سے خالی نہ ہو۔ اور گداگر بن کر نہ آئے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اوّل طلب شرط ہے۔ ع آب کم جو تشنگی آور بدست

حکیم بھی بیمار کو دوا دیتا ہے۔ لوگ دنیا کے واسطے قسطنطنیہ تک مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کے لئے جاتے ہیں۔ دنیا کے واسطے دین، ایمان اور جان ضائع کرتے ہیں اتنا لمبا سفر صرف دنیا کے واسطے کرتے ہیں۔ مگر اس وقت کے طالبانِ خدا تعالیٰ کو دو میل چل کر کسی بزرگ کی خدمت میں جانا دو سو کوس نظر آتا ہے۔ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۔ (طٰہٰ - ۴۷) اور سلامتی اس کے لئے ہے جو سیدھی راہ پر چلے۔ ■■

تبصرہ نگار : اختر راہی ایم۔ اے (سیاسیات و تاریخ)

تعارف و تبصرہ

تبصرے کے لئے ہر کتاب
کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے

قصیدہ بردہ (منظوم اردو ترجمہ) مؤلف : امام بوصیریؒ مترجم : عبداللہ ہلال صدیقی
ناشر : مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ کراچی ۔ صفحات : ۸۰ قیمت درج نہیں۔

شیخ شرف الدین بوصیریؒ (م ۶۹۴ھ) اپنے دور کے صاحب دل بزرگ تھے ۔
کہا جاتا ہے کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا ۔ اطباء کے علاج معالجے کے باوجود صحت یاب نہ ہوئے آخر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و نعت میں قصیدہ لکھ کر بارگاہ الٰہی میں دعا کی کہ انہیں صحت کاملہ ادا ہو۔ اس کے بعد انہیں خواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ بوصیریؒ نے عالم خواب میں قصیدہ سنایا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوئے اور قصیدہ نگار پر ایک چادر ڈال دی اور جسم پر ہاتھ پھیرا۔ جب قصیدہ نگار کی آنکھ کھلی تو اس کا جسم تندرست ہو چکا تھا۔ اسی "چادر" کی نسبت سے اسے "قصیدہ بردہ" کہا جاتا ہے۔

عالم اسلام میں قصیدہ بردہ کو بے پناہ مقبولیت حاصل رہی ہے۔ اس کی بکثرت شرحیں لکھی گئیں اور مختلف شعراء نے تخمیس و تضمین کی۔ زیر تبصرہ منظوم ترجمہ ہلال صدیقی صاحب کی کاوش طبع کا نتیجہ ہے۔ بوصیریؒ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور زندگی سے متعلق بعض ضعیف روایات درج کی ہیں۔ تاہم اس خامی کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے ؎

زندہ دار شب نبیؐ کے پاؤں کر جاتے ورم
کیا ستم میں نے کیا بھولا میں وہ نقش قدم

آپ نے اپنا شکم فاقہ میں اکثر یوں کسا
نرم پہلوئے نبیؐ سے بھوک میں پتھر بندھا

بن کے سونے کے پہاڑ آئے کہ کچھ مائل کریں
ہمت عالی نہ کچھ بھی لائی خاطر میں انہیں

عبداللہ ہلال صاحب کا ترجمہ سادہ اور پرکیف ہے۔ مگر بعض اوقات ان کا ترجمہ غلو کی

حد کو پہنچ گیا ہے ۔ مثال کے طور پر "مُنَزَّہٌ عَنْ شَرِیْکٍ فِیْ مَحَاسِنِہٖ" کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے ؂ خوبیوں میں یوں منزہ احمد بے میم ہیں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "احمد بے میم" یعنی "احد" کہنا کسی طرح درست نہیں ۔ یہ تو شرک فی الذات ہے ۔ بوصیریؒ ہی کی نصیحت پیش نظر رکھی جاتی تو بہتر تھا ۔ ؂

جو نصاریٰ کہتے ہیں اپنے نبی کو تو نہ کہہ

بحیثیت مجموعی زبان و بیان کے اعتبار سے ترجمہ نہایت اچھا ہے ۔

علم الصیغہ (اردو) | مؤلف : مولانا مفتی عنایت احمد کاکورویؒ ۔ مترجم : محمد رفیع عثمانی

ناشر : کلام کمپنی ۔ مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی ۔ قیمت ۳/- روپے

انگریزوں کی آمد سے پہلے برصغیر پاک و ہند میں فارسی زبان کا سکہ چلتا تھا اور مدارس میں ذریعۂ تعلیم یہی زبان تھی ۔ اگرچہ اردو روز بروز مقبول ہو رہی تھی مگر علماء کا اعلیٰ طبقہ فارسی ہی میں خط کتابت کرتا اور تصنیف و تالیف کرتا تھا ۔ مفتی عنایت احمد کاکورویؒ نے عربی زبان کے مبتدیوں کے لئے ایک کتاب "علم الصیغہ" لکھی تھی جو اختصار و ایجاز اور جامعیت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے ۔ جو اسی خوبی کی بناء پر عربی مدارس میں پڑھائی جانے لگی ۔

تقسیم برصغیر کے بعد حالات بدل گئے ۔ فارسی کا چلن اٹھ گیا اور اس کی جگہ اردو نے لے لی آج ہمارے دینی مدارس میں بھی اردو کا سکہ زیادہ چلتا ہے ۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسی فارسی کتابوں کو جن کے ذریعے عربی قواعد کی تعلیم مقصود ہے ۔ اردو کا جامہ پہنایا جائے ۔ دارالعلوم کراچی کے استاد جناب محمد رفیع عثمانی نے علم الصیغہ کا شگفتہ ، رواں اور آسان ترجمہ کیا ہے ۔

مترجم موصوف نے کتاب میں ایک جاندار مقدمہ شامل کیا ہے جس میں علم الصرف اور علم الاشتقاق کی تعریف ، مقصد اور موضوع پر بحث کی ہے ۔ مؤلف کتاب کے مختصر حالات بھی درج ہیں ۔

شروع میں مولانا محمد یوسف بنوری کی تقریظ اور مفتی محمد شفیع کا پیش لفظ ہے ۔ دونوں بزرگوں نے کتاب اور اس کے ترجمے کی تعریف کی ہے ۔ امید ہے کہ دینی مدارس میں اس ترجمے کو مقبولیت حاصل ہوگی ۔

اسلام کا نظام تقسیم دولت ۔ | مؤلف : مفتی محمد شفیع صاحب ۔ ناشر : مکتبہ دارالعلوم کراچی ۔ کتابت و طباعت عمدہ ، قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے ——— آج انسانی دنیا دو بلاکوں میں

بٹی ہوئی ہے۔ ایک بلاک امریکہ اور برطانیہ کے زیر سرکردگی سرمایہ داری کو عروج تک لے گیا ہے۔ اور دوسرا بلاک روس اور چین کے زیر اثر اشتراکیت کو غالب کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ مگر ان دونوں معاشی نظاموں نے انسانیت کو دکھوں کے سوا کچھ نہ دیا۔ سرمایہ داری نے بھوک ننگ اور افلاس کے "تحفے" پیش کئے تو اشتراکیت نے ظلم واستبداد اور تعذیب کے نئے نئے شکنجے۔

ان مادی نظاموں کے برعکس اسلام نے جو معاشی نظام پیدا کیا ہے۔ اسی میں راہ گم کردہ انسانیت کی نجات ہے۔ علمائے اسلام نے اسلامی نظام کے ہر پہلو کو نکھارا ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب نے عالمی اسلامی کانفرنس (منعقدہ ۱۹۶۸ء راولپنڈی) میں اسلام کے نظام تقسیم دولت کے موضوع پر بصیرت افروز مقالہ پڑھا تھا۔ جس میں قرآن و سنت کی روشنی میں تقسیم دولت کا اسلامی تصور اور طریقہ کار پیش کیا تھا۔ اہل بصیرت نے مقالہ بہت پسند کیا۔ اور عوام کی بھلائی کی خاطر شائع کر دیا گیا۔ مفتی صاحب نے اسلام کے معاشی نظام اور مادی نظاموں کا تقابلی مطالعہ کر کے بتایا ہے کہ اسلام ہی بہترین معاشی زندگی کا ذمہ دار ہے۔

مقالہ میں اختصار برتا گیا ہے جو مقصد تالیف کے لحاظ سے ناگزیر تھا کہ ایک نشست مختصر مقالہ کی ہی متحمل ہو سکتی ہے۔ درحقیقت مفتی صاحب کے اشاروں کو تفصیل سے پیش کرنا دوسرے اہل علم کا فریضہ ہے۔ معاشیات کے طلبہ اور عام مسلمانوں کے لئے کتابچے کا مطالعہ معاشیات کے کئی پہلوؤں کو بے نقاب کرنے کا سبب ہوگا۔

گنج بخش بحیثیت عالم | مؤلف: مجید یزدانی ریسرچ سکالر محکمہ اوقاف۔

ناشر، ادارۂ علوم اسلامیہ خانقم بازار انارکلی۔ لاہور ——— زیر تبصرہ کتاب مجید یزدانی کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جس میں انہوں نے علی ہجویریؒ کے علمی مقام کا تعین کیا ہے۔ بعض سطحی مورخین نے شاہ صاحب کی تالیف "کشف المحجوب" کے بارے میں رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "زاہدانہ رنگ جو ابتدائی صوفیوں میں کبھی کبھی رہبانیت کی حد تک پہنچتا ہے۔ ان میں بھی موجود تھا۔ اپنی تصانیف میں انہوں نے عورتوں کی خوب خبر لی ہے۔" ایسے ہی ریمارکس نے مجید یزدانی کو حقیقت سے پردہ اٹھانے کی جرأت دلائی اور انہوں نے یہ بیش قیمت مقالہ تحریر کیا۔

کتاب ایک مقدمہ اور تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں علی ہجویریؒ کے حالات زندگی پیش کئے گئے ہیں جو حسن ترتیب کے لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ دوسرے باب "حصول علم"

میں ان کے اساتذہ کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور علی ہجویریؒ کے حصول علم کی روداد پیش کی گئی ہے۔ تیسرا باب درحقیقت کتاب کی جان اور موضوع ہے۔ اس میں کشف المحجوب کا مختصر خلاصہ پیش کیا ہے جسے بجا طور پر کشف المحجوب کا عطر کہا جا سکتا ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے "کشفِ حجاب" کا عنوان قائم کر کے حضرت علی ہجویریؒ کے پیش کردہ علمی نکات پر گفتگو کی ہے۔ کتاب قابلِ مطالعہ ہے اور اس کا ہر لائبریری میں موجود ہونا ضروری ہے۔

احوال و کوائف دار العلوم

شاندار نتیجہ | دار العلوم حقانیہ کے دورۂ حدیث شریف سال گذشتہ کے طالب العلم مولوی عبدالقیوم بن ملا شادی صاحب مقام شال درہ ضلع کوئٹہ بلوچستان ۶۰۰ نمبرات میں سے ۵۲۸ نمبر لیکر وفاق المدارس العربیہ کے امتحانات میں شریک مدارس فوقانیہ میں ملک بھر میں اوّل نمبر پر کامیاب ہوئے۔ دوسری پوزیشن مدرسہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی کے مولوی عبدالقیوم بن محمد غوث نے حاصل کی وفاق المدارس کے امتحانات دورہ میں ۲۹۶ طلبہ نے شرکت کی جس میں دار العلوم حقانیہ کے طلبہ دورہ کی تعداد ۱۱۰ تھی۔ دار العلوم اس شاندار کامیابی پر حق تعالیٰ کا شکر گذار ہے۔ مفصل نتیجہ اگلے پرچہ میں ملاحظہ فرما دیں۔ دار العلوم کے مہتمم حضرت شیخ الحدیث صاحب اور وفاق کے ناظم اعلیٰ مولانا مفتی محمود صاحب نے اس شاندار کامیابی پر کامیاب فضلاء کو ہدیۂ تہنیت پیش کی ہے۔

تعلیمی سال کا آغاز | بحمد اللہ عزوجل نامساعد حالات کے باوجود دار العلوم کا نیا تعلیمی سال اپنے وقت پر شروع ہو چکا ہے۔ دار الحدیث میں تمام طلبہ اساتذہ وعملہ کے ایک بڑے مجمع میں ختم کلام پاک اور پھر حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے درسِ ترمذی شریف سے اسباق کا آغاز ہوا اور حضرت نے علم کی اہمیت اور ذمہ داریوں پر مؤثر خطاب فرمایا۔ ملک و بیرون ملک سے طلبہ کی کثرت آمد کے باوجود محدود وسائل کی وجہ سے صرف ۶۰۰ طلبہ کو داخل کیا جا سکا جس میں دورۂ حدیث کے طلبہ کی تعداد ڈیڑھ سو سے متجاوز ہو چکی ہے۔

دار العلوم کے دو اساتذہ حضرت مولانا محمد علی صاحب سواتی و حضرت مولانا جلال الدین صاحب افغانی سفر حج پر تشریف لے گئے ہیں۔

★